اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاهور

جولائی ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 July2019

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

''قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی''
اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب
صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے
اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰسٓ، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ۷۶
ہماری لاگت مع ڈاک خرچ ۱۶۰ روپے

ہدیہ: خدمت قرآن میں آپ کو شریک کرنے کے لیے صرف ۱۰۰ روپے
بذریعہ: وی پی، منی آرڈر، موبی کیش (اکاؤنٹ نمبر 0306-4640366)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

بلا معاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

- صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
- جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
- اساتذہ اور طلبہ (و طالبات) کے لیے الگ کتابیں
- اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون: 0333-4287640، 0300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت ۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات	۷۲
پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۷۶
ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
نصابِ مدنیؒ	۴۰
اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
مسلم نشاۃ ثانیہ ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۹ء/ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ

مشمولات

O فکر و نظر
قارئین البرہان سے مشاورت ۴
O تعلیم و تربیت
- مسلمانوں کی قومی تعلیم (آخری قسط) مولانا محمد علی جوہرؒ ۷
- جدید تعلیم کا زہر حافظ محمد موسیٰ بھٹو ۱۳
- سیرت النبی اور سماجی علوم پروفیسر دلاور خان ۱۴
- دینی مدارس - انسانی وسائل کا عظیم سرچشمہ ان وسائل کو کیسے مفید تر بنایا جائے؟ پروفیسر ملک محمد حسین ۱۶
- دینی مدارس کی مرکزی تعلیمی دھارے میں شمولیت علامہ خلیل الرحمن قادری ۲۰
- دینی مدارس کو مرکزی تعلیمی دھارے میں لانا مسئلے کا حل نہیں مدیر ۲۹
O اسلام اور مغرب
امریکہ ایران اور پاکستان ڈاکٹر محمد امین ۳۲
O اسلام اور مغربی تہذیب
- مغربی تہذیب - کفر کی جدید شکل ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۳۴
- سرمایہ دارانہ نظام کے نتائج عثمان صفدر ۳۸
O فہم دین
مفرور مسلمان لڑکیوں کا نکاح اور اس کی عدالتی حمایت غیر شرعی ہے مدیر ۴۸
O مطالعۂ کتاب
''قلم کا سفر'' از ڈاکٹر انوار بگوی پروفیسر ملک محمد حسین ۵۳
O تبصرۂ کتب
مختصر تبصرے مدیر ۵۷

فکرونظر

قارئین البرہان سے مشاورت

۱۔ البرہان اگلے ماہ اپنی عمرعزیز کے دس سال پورے کررہا ہے۔ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہیں کہ اس نے ہمیں اس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کی توفیق دی۔ہم اس موقع پر اپنا احتساب بھی کرنا چاہتے ہیں اور بعض امور میں قارئین سے مشاورت بھی کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہم نے البرہان کے اجراء کے وقت چار موضوعات پر کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا: تعلیم وتربیت،مغربی فکروتہذیب، پاکستان میں غلبۂ دین اور اتحاد امت۔الحمدللہ ہم نے انہی چار موضوعات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

ہم نے اپنی استطاعت کی حدتک البرہان کوایک علمی اورفکری مجلہ بنانے کی کوشش کی لیکن اسلوب میں ہم نے اکیڈیمک ریسرچ (یا یونیورسٹی ریسرچ) کا اتباع کرنے کا تکلف نہیں کیا بلکہ جہاں ضرورت محسوس کی،نوارا تلخ ترمے زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی کی وجہ سے اپنا لہجہ دبنگ اور آہنگ بلند رکھا جس کی وجہ سے ممکن ہے بعض دوستوں کو ہمارا لہجہ غیرعلمی اور اسٹیبلشمنٹ مخالف محسوس ہوا ہو۔ہم نے فتوی کی زبان اور مناظرانہ (Polemic) انداز سے اکثر بچنے کی کوشش کی البتہ بعض معاملات میں ہم جذباتی بھی ہوئے جیسے توہینِ رسالت کا مسئلہ،جس پر ہمیں کوئی شرمندگی نہیں۔اپنے خلاف اوراپنے نقطۂ نظر کے خلاف مضامین بھی ہم نے کئی دفعہ البرہان میں دیے۔

اہل مغرب اوران کی فکروتہذیب، پاکستانی حکمرانوں، سیاسی جماعتوں اور دینی سیاسی جماعتوں پر ہماری تنقید اکثر اوقات سخت رہی۔ہم اصولاً اس بات کوتسلیم کرتے ہیں کہ تنقید جتنی نرم،شائستہ اورمدلل ہووہ اتنی ہی مفیداورموثر ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں بے حسی،حقائق سے صرفِ نظر،فکری جموداورحق کواپنے مسلک ومشرب میں محصور سمجھنے کی روش عام ہے اور معمول کی زبان کولوگ اہمیت ہی نہیں دیتے جب تک چیخ کر

بات نہ کی جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں پاکستان کے دینی عناصر مثلاً مولانا فضل الرحمن اور خصوصاً جماعت اسلامی کے خلاف تنقیدی مضامین کثرت سے طبع کرنا پڑے جن کی زبان سخت تھی۔ اس سے اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں اور آئندہ نرمی اور شائستگی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

۳۔ ہم قارئین کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارا احتساب کریں، ہماری خامیاں اور غلطیاں ہمیں بتائیں تاکہ آئندہ ہم ان سے اجتناب کی فکر کریں۔

۴۔ ہم قارئین سے یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ وہ البرہان کی پالیسی، موضوعات اور معیار کی بہتری کے حوالے سے ہماری رہنمائی کریں اور اپنی تجاویز سے نوازیں۔

۵۔ ہمارے ہاں یہ بات زیر بحث آتی رہی ہے کہ البرہان کو صرف تعلیم وتربیت تک محدود رکھا جائے اور اس کا اسلوب خالص علمی اور فکری ہو لیکن راقم اس پر یکسو نہ ہو سکا۔ اب اس کے لیے یہ تجویز ذہن میں آ رہی ہے کہ البرہان کا ایک ماہ کا پرچہ تعلیم وتربیت کے لیے وقف کر دیا جائے جس میں کوئی دوسری چیز نہ ہو اور اگلا شمارہ فہم دین، تہذیب مغرب اور پاکستان میں غلبۂ دین کے مباحث کے لیے مختص ہو۔ عارضی طور پر یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے اور جب اللہ تعالیٰ وسائل دیں تو تعلیم وتربیت پر ایک سہ ماہی علمی جریدہ اردو اور انگریزی میں الگ سے شائع کیا جائے۔

۶۔ اور آخر میں سب سے اہم بات۔ البرہان کی مالی حالت بہت پتلی ہے اور یہ کسی بھی وقت بند ہو سکتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں: بنیادی سبب یہ ہے کہ راقم میں کچھ ٹوٹی پھوٹی صلاحیت پڑھنے، لکھنے اور سوچنے کی تو ہے لیکن مینجمنٹ اور مارکیٹنگ کی صلاحیت اس میں نہیں ہے اور نہ ہی آج تک ایسی صلاحیت رکھنے والے کسی فرد/ افراد کا مخلصانہ تعاون میسر آ سکا۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم جمہور اہل سنت سے متفق ہونے کے باوجود کسی دینی، سیاسی، اصلاحی جماعت اور فقہی وکلامی مسلک سے منتسب اور منسلک نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے تحزب اور اس کے فوائد سے محروم ہیں۔ اگر یہ خامی ہے تو بہر حال ہم میں ہے لیکن یہ کوئی حادثہ نہیں ہماری سوچی سمجھی روش ہے اور عمر کے اس حصے میں فکری آزادی سے محروم ہونا طبیعت

کو گوارا بھی نہیں۔

ان حالات میں البرہان کی اشاعت میں اضافہ ہوسکا، نہ اسے اشتہار میسر آسکے اور نہ ایسے مخیر افراد میسر آسکے جو اس کا مالی بوجھ اٹھالیں۔ البرہان کی موجودہ صورت میں بقاء واستمرار توکم ازکم ہے ورنہ البرہان کی بہتری کے لیے کئی منصوبے ہمارے ذہن میں ہیں۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ کے بعد اگر ہمارا کوئی دنیوی سہارا ہوسکتا ہے تو وہ البرہان کے قارئین ہی ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ ان میں سے جو البرہان کے مشن کو سمجھتے ہیں وہ ہمارے دست و بازو بنیں اور اسے اور اس کے مالیات کو سنبھالنے میں ہماری مدد کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین. عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

علمی لیڈرشپ

اگر عالم اسلام کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو، اگر وہ عالمگیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خودمختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈرشپ بھی بہت ضروری ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مسئلہ بہت گہرے غور وفکر کا محتاج ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف وتالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے۔ اس کام کے سربراہ عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق وتنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کے اصل سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور اسلامی روح سے ان کا قلب ونظر معمور ہو۔

(سید ابوالحسن علی ندویؒ)

’’جب تعلیم کا بنیادی مقصد **نوکری** کا حصول ہو تو معاشرے میں **نوکر** ہی پیدا ہوتے ہیں۔‘‘

پروفیسر رفرف

تعلیم و تربیت

مولانا محمد علی جوہرؒ
ترجمہ: بشیر احمد دانی

مسلمانوں کی قومی تعلیم (آخری قسط)

جامعہ ملیہ کے قیام کے وقت تعلیم کے بارے میں مولانا جوہرؒ کے خیالات وافکار

تعلیمی مراحل

اس کی وضاحت بھی کر دینی چاہیے کہ تعلیم کے مرحلوں کی موجود تقسیم میں نمایاں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کی دیہاتی بچے یا قصبات میں رہنے والے غریب گھرانوں کے بچے اپنی عمر کے بارھویں سال کے بعد تعلیم حاصل کر سکیں گے اور مستقبل میں ایک عرصہ تک ۷۵ فیصد کو خواہ کسی بھی قسم کی تعلیم دی جائے وہ اپنی ذات میں ایک مکمل یونٹ (اکائی کی ہونی چاہیے)۔ تاہم ان کے لیے جو آئندہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں، کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہیے۔ اور چونکہ یہ عمر بچپن سے جوانی کی فطری تبدیلی کی ہوتی ہے، اس لیے اسے تعلیم میں بھی ایک فطری سنگ میل ہونا چاہیے۔ اس لیے اس مرحلہ پر طریق تعلیم اگلے مرحلہ کے طریق تعلیم سے مختلف ہونا چاہیے۔ یہاں ماسوائے حساب کے جسے اسی انداز میں نہیں پڑھایا جاسکتا مختلف علوم میں تقسیم نہ ہونی چاہیے بلکہ اس طرح ہو کہ اسباق کو پڑھا کر اسے زبانی ہدایات کی صورت میں ذہن نشین کیا جائے تاکہ بچہ کتاب کے روزمرہ اسباق سے معلومات اور اخلاقی تربیت حاصل کرے۔

ہمیں کتب تیار کرنا پڑیں گی اور تجویز یہ ہے کہ ایک ایسے ماہر تعلیم کی ادارت میں جو بچے کی نفسیات اور ادبی طرز پر عبور رکھتا ہو۔ اس مقصد کے لیے بہت سے مصنفین کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں جنہوں نے سائنس میں اختصاصی مہارت حاصل کی ہو۔ کچھ ایسے ہیں جنہوں نے علوم میں اور کچھ وہ ہیں جو ہندوستانی اور اسلامی تاریخ میں اور چوتھے وہ جو ادب کا اچھا مطالعہ کرتے ہوں اور علی ہذا القیاس ان درسی کتابوں کے مضامین کو متعلقہ گروپ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اور چیف ایڈیٹران میں سے ہر کتاب کی ضخامت اور اس میں شامل ہونے والے اسباق کی تعداد کا اور ہر مضمون سے متعلق اسباق کا تعین کرے۔ اس طرح سے

پرائمری کے مرحلہ پر طلباء کو جو تعلیم دینی چاہیے وہ مصنفین کے مختلف گروپوں کے باقاعدہ اسباق پر تعلیم ہونی چاہیے اور کتاب کو صرف مادری زبان کی درس وتدریس کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے بلکہ اُسے وہ درست اور صحیح معلومات بھی فراہم کرنا چاہئیں جو انسان کے لیے ضروری ہیں اور جو ۱۲ سال کا بچہ آسانی سے سمجھ سکے۔ اس لیے بچہ کا امتحان صرف درسی کتب پڑھنے ہی سے نہیں، بلکہ سائنس، مذہب، تاریخ، جغرافیہ، شہریت وغیرہ جیسے موضوعات اور نفس مضمون میں بھی لیا جانا چاہیے۔

اگلا مرحلہ ثانوی تعلیم کا ہوگا جو موجودہ ہائی اسکول کے برابر نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ کے معیار کا ہوگا، جو پرائمری ہی کی طرح ۵ سال میں طالب علم کی عمر کے سترھویں سال میں ختم ہوگا۔ اس مرحلہ پر مادری زبان میں تعلیم کا مقصد زبان اور ادب کی تعلیم ہی ہونا چاہیے۔ اس پر دوسرے مضامین علیحدہ مضامین کی حیثیت سے پڑھانے چاہئیں۔ درسی کتابوں کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ ختم کر دینا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ تین سالوں میں جو موجودہ میٹرک کے معیار کے برابر ہوگا، ایک نوجوان مادری زبان، عربی کے علاوہ کوئی سے تین مضامین لے لے، لیکن آخری دو سالوں میں جو انٹرمیڈیٹ کے برابر ہوں گے اُسے صرف دو اختیاری مضامین لینا ہوں گے۔ اس کے انتخاب واختیار کو محدود کرنا ضروری نہیں جتنا کہ اب ہے بلکہ اُسے موقع ملنا چاہیے کہ وہ ایسے مضامین لے سکے جن کے لیے وہ رجحان رکھتا ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر اپنے مضامین کے خود انتخاب کا موقع فراہم کیے جانے کا مطلب اختصاصی تعلیم نہ ہونی چاہیے جب تک کہ وہ یونیورسٹی کے مدارج تک نہ پہنچ جائے۔

پرائمری کے مرحلہ پر اُسے ہر اہم موضوع پر ضروری معلومات حاصل کرنی ہوں گی چاہے یہ ابتدائی نوعیت ہی کی کیوں نہ ہوں مگر یہ اتنی ہوں گی کہ مزید علم کے لیے اس کی طلب میں اضافہ کریں۔ اور وہ اس علم کا عملی فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ ان کے تفصیلی مطالعہ میں اچھا خاصا وقت صرف کرے۔ اس لیے اُسے ثانوی مرحلہ پر جو موقع دیا جارہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی مضمون سے وہ بالکل ہی ناواقف رہ جائے بلکہ یہ کہ اُسے جن مضامین کا فطری رجحان ہو ان میں مزید علم حاصل کرے۔

یونیورسٹی مرحلہ پر گروپ سسٹم کو یک لخت ختم کر دینا چاہیے بلکہ مضامین کو مختلف وسیع علوم

(Schools) کے تحت مرتب کیا جانا چاہیے مثلاً تاریخ، فلسفہ، ریاضی، سائنس، ادب، قانون ،عمرانیات اور بلاشبہ اسلامی تعلیمات کو خاص صورتوں میں طالب علم کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ مختلف Schools کے اسباق میں حاضر رہے اور اس خاص کورس کے اساتذہ اور ممتحن کی تسلی پر اُسے ڈپلوما دیا جائے۔

یونیورسٹی کے مرحلہ پر پڑھانے کا طریق لیکچر سسٹم سے مختلف ہونا چاہیے اس میں طالب علم کو استاد کے لیکچر کے ساتھ ساتھ نوٹس لیتے رہنا چاہیے۔ پھر ایک ٹیوٹوریل سسٹم ہو جس میں استاد طالب علم کے پرائیویٹ مطالعہ کی رہنمائی اور ترتیب میں مدد دے نہ یہ کہ درسی کتاب ہاتھ میں لے کر اور کلاس میں بیٹھ کر تشریحات کرے۔ اسی لیے موجودہ انٹرمیڈیٹ سٹیج کو ثانوی سٹیج میں مدغم کیا گیا ہے جو اس سے بے حد قریب ہے۔

یہ پہلے ہی بتایا گیا ہے کہ آئندہ کچھ عرصہ تک تقریباً ۷۵ فیصد آبادی پرائمری کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے گی اور پچاس فیصد سے زائد ثانوی تعلیم کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اس لیے اسے بھی پرائمری ہی کی طرح کسی مصنوعی پابندی کے بغیر ایک اور متعین اکائی ہونا چاہیے۔ سترہ سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد ایک نوجوان کو جس نے سکول کورس مکمل کر لیا ہو (جو موجودہ انٹرمیڈیٹ معیار کے برابر ہو) ایک مہذب اور شائستہ انسان ہونا چاہیے خواہ وہ آگے نہ بھی پڑھے۔ وہ افراد جو علمی ذوق رکھتے ہوں اور اس کی تسکین کے لیے وقت بھی ہو یا وہ جو علمی موضوعات پر آگے کام کرنا چاہیں صرف وہی یونیورسٹی سٹیج میں داخل ہوں گے۔ یہاں اُسے مزید تین سال صرف کرنے چاہئیں اور ۲۰ برس کی عمر کو پہنچ کر اُسے گریجوایٹ ہو جانا چاہیے۔ مگر گریجویشن کا مطلب موجودہ ہندوستانی بی اے کی ڈگری کا حصول نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم، تحقیق اور تصنیف کے لیے انگریزی یونیورسٹی کا بی اے آنرز ہوگا اور اسے ۲۲، ۲۳ برس کی عمر میں حاصل کرنا ممکن ہونا چاہیے۔

اس طرح یہ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے میں جو وقت صَرف ہوگا وہ اُس وقت سے لازماً کم ہونا چاہیے جو اب بی اے کی ڈگری لینے میں ہوتا ہے۔ اور اب اس کا جو کم سے کم معیار ہو سکتا ہے وہ آج کل کے ایم اے کا ہے۔ یہ صرف مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور بہتر طریق تعلیم سے ہی ممکن ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان سائنس میں اس

سے کہیں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیں جتنی وہ اس وقت لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے کی مضبوط بنیاد کے لیے پرائمری سٹیج پر ہی بچوں کو سائنسی علوم کی ضروری تعلیم دی جائے۔ اُمید ہے کہ ثانوی مرحلہ پر سکولوں میں بھی سائنس کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور موجودہ تناسب کی نسبت زیادہ طلباء سائنس میں اپنی ڈگریاں لیں گے۔ لیکن سائنس میں قیمتی تجربہ گاہوں کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ فیصلہ مسلمان قوم کو ہی کرنا ہے کہ وہ مذہب کے بعد اس اہم ترین مضمون کی تعلیم کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

تاریخ

تاریخ کی تدریس میں تاریخ اسلام اور تاریخ ہند دونوں شامل ہوں گی اور ثانوی کورس کے آخری دو سالوں میں ایک تاریخی مضمون انتخاب کرنا ہوگا مثلاً یونان، روم یا ہندوستان کی قدیم تاریخ، یورپین یا ایشیائی تاریخ کا کوئی ایک دور یا انگلینڈ کی آئینی تاریخ کا خلاصہ۔ کلیۂ تاریخ میں اس کی گنجائش رکھنی ہوگی۔

لیکن یہ بتا دینا چاہیے کہ تاریخ کی تدریس کا موجودہ طریق تسلی بخش نہیں ہے، اس میں سب ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور لاتعلق محسوس ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ پڑھانے کا نہایت غلط اور فرسودہ طریق ہے جس کا نتیجہ محدود نقطۂ نظر اور بین الاقوامی رقابت کی شکل میں نکلا ہے، اس لیے یہ تجویز ہے کہ خواہ کوئی تاریخی مضامین پڑھائے جائیں، اُن کا طریق تدریس ایسا ہونا چاہیے کہ اُس میں تاریخ کی حقیقی روح جھلکتی نظر آئے۔ اس مقصد کے لیے پرائمری سٹیج پر ہی طلبا کو ان بڑی بڑی عالم گیر تحریکوں سے روشناس کرانا چاہیے جن سے اس ملک میں تاریخ اور عوام الگ تھلگ نہیں رہ سکتے، بعد کے مرحلوں میں عالم گیر تحریکوں کا خاکہ یا مختلف قوموں اور ملکوں یا مختلف عہدوں میں نسل انسانی کی تاریخ پڑھائی جانی چاہیے۔ اس میں کسی بڑی تفصیل میں جانے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ یہ ممکن ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس طرح کے مطالعہ کے بغیر اس دور کی گہری حب الوطنی کی بناء پر تاریخ کی تدریس مزید زوال پذیر ہوگی۔ مسٹر ایچ جے ویلز کی نئی تاریخ تسلی بخش تو نہیں، اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، نہایت خام و ناقص ہے۔ مگر پھر بھی تاریخ پر ایک شاندار کام ہے اور ان کے طریقوں کو وہ لوگ یقیناً اختیار کریں گے جو تاریخی تفصیلات پر زیادہ وسیع اور درست معلومات رکھتے ہیں۔

ریاضی

جہاں تک پرائمری میں ریاضی کی تدریس کا تعلق ہے، فی الوقت بچوں کے ذہن کو ان طویل، دقیق اور مشکل سوالوں سے بھر دیا گیا ہے جنہیں بڑے آدمیوں کی عملی زندگی میں حل کرنے کی شاید ہی کبھی ضرورت پڑتی ہو۔ اس لیے ایسے دقیق سوالوں کی مشق اور Valgar Fractios کی سختی سے مخالفت کی جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ صبر اور محنت کا امتحان ہو لیکن یہ چھوٹے بچوں کی بجائے بڑے نوجوانوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اس طریق کو ختم کر کے ہی یہ ممکن ہوگا کہ تیزی سے آگے بڑھا جائے اور ایک بارہ برس کے بچے کو رول آف تھری، سود، رقبہ وغیرہ کے سوالات حل کرنے کے لیے مناسب حساب پڑھایا جائے جس سے ایک دیہاتی یا شہری بچے کا عملی زندگی میں ہر روز واسطہ پڑے گا۔ ایسے قاعدوں پر مہارت جس کے نتیجہ میں پیش آنے والے تعلیمی معاملات سے بالکل ناواقفیت ہو، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ کم وقت میں زیادہ وسیع مہارت حاصل کی جائے جو لوگوں کے اپنے روزمرہ کے لین دین میں کام آئے۔

ہمیں حساب اور پیمائش کے ضروری علم کے علاوہ ریاضی کی تدریس کا طریق ختم کر دینا چاہیے۔ الجبراء اور جیومیٹری کی تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ ممکن نہیں کہ الجبراء اور جیومیٹری کو لازمی مضمون رکھا جائے، البتہ وہ طالب علم جو حساب کے لیے ایک فطری رجحان رکھتے ہوں اور جو مستقبل میں ایسے پیشہ میں داخل ہونا چاہتے ہوں جہاں ان کو ریاضی کے علم کی ضرورت ہو وہ ثانوی مرحلہ پر اسے بحیثیت انتخابی مضمون کے لے سکتے ہیں۔

ڈرائنگ

پرائمری اسٹیج پر مبادیات ڈرائنگ کی تعلیم بھی شامل کی جانی چاہیے۔ اس کے ذریعہ بچے کی آنکھوں اور ہاتھوں کی ایسی تربیت ہو جس کے نتیجے میں اس میں حسن و توانائی کو محسوس کرنے کی قابلیت پیدا ہو سکے۔ لیکن ثانوی اسٹیج پر ڈرائنگ اختیاری ہونا چاہیے اور صرف وہ طلباء جو مستقبل میں ایسے پیشہ میں داخل ہوں جہاں ڈرائنگ کا عمل دخل ہو، اسے اختیاری مضمون کے طور پر لے لیں۔

ہنرمندی

موجودہ طرزِ تعلیم سے ہمارے منصوبے کا ایک نمایاں فرق جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ طلبہ کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی تربیت اور کسی نہ کسی ہنر کے حصول کا بھی موقع ملے۔ پرائمری مراحل پر مفید تفریح کے ساتھ ساتھ یہ بچے کی آنکھ اور ہاتھ کی تربیت بھی ہوگی۔ مگر چونکہ پرائمری اسٹیج کے بعد بچوں کی اکثریت کاشتکار رہے گی اس لیے انہیں زراعت میں نظریاتی اور عملی تربیت اور اُسے حفظانِ صحت سے بہرہ ور کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ پھول، سبزیاں اور باغبانی بھی آسانی سے کاشتکاری میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ قصباتی سکولوں میں اس میں کچھ ترمیم کرنی چاہیے اور زرعی تربیت کے لیے اور کوئی اور مناسب طریق وضع کر لینا چاہیے۔ ثانوی اور یونیورسٹی کے مرحلوں میں بھی ووکیشنل تعلیم ہونی چاہیے۔ ہر ایک سکول اور کالج ہر طرح کی تربیت نہ تو دے سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے لیکن مقامی طور پر ہر سکول اور کالج مناسب ووکیشنل تربیت کا انتظام کر سکتا ہے۔ مثلاً مراد آباد کے سکول میں بھرت یا گلات کی تدریس، اور علی گڑھ میں تالا سازی کی تربیت میں کوئی مشکل نہ ہونی چاہیے، لیکن کھڈی کا کام، کھانا پکانا، رنگ سازی، بنائی، چمڑا رنگنا، جلد سازی، اکاؤنٹنٹ، سٹینوگرافی، آہن گری، درزی، چمڑے کی اشیاء بنانے وغیرہ جیسے مختلف کاموں سے انتخاب کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے۔ ایک طالب علم کو اپنے پورے دورِ طالب علمی میں زیادہ سے زیادہ پیشوں میں مہارت حاصل کرتے رہنا چاہیے تاکہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی طالب علم موجودہ مالی بے بسی اور کم تنخواہ والی ملازمتوں مثلاً کلرکوں یا پبلک سروس کے دوسرے ملازمین پر انحصار سے نجات حاصل کر لیں۔ کوئی نوجوان ایسا نہ ہو جو سرکاری ملازمت پر غلامانہ انحصار کا یہ جواز پیش کر سکے کہ اُس کے پاس تو بس یہی تعلیم ہے جس سے وہ کلرک بن سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی اس پیشہ کو برقرار رکھے جس کی تربیت اُس نے سکول اور کالج میں پائی تھی۔ لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے تو یہ تربیت کام آ سکتی ہے اور اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ان سکولوں میں ادبی اور ثقافتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک نوجوان لباس سازی، ہوٹل، لانڈری یا آہن گری کی اچھی تجارت نہ کرے۔ ایک تربیت یافتہ نوجوان نہایت قلیل سرمایہ سے یا صرف اپنی محنت سے کچھ ہی عرصہ میں اپنا کاروبار چلا سکتا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۹)

تعلیم و تربیت

حافظ محمد موسیٰ بھٹو

جدید تعلیم کا زہر

دورِ جدید میں امت کو بہت سارے چیلنج درپیش ہیں جنہیں سمجھ کر بہتر حکمت عملی سے ان سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک بڑا چیلنج تو یہ ہے کہ رواجی معاشی نظام تعلیم جو انگریز کا مسلط کردہ ہے اس میں دنیا پرستی، مادہ پرستی، نفس پرستی اور لادینیت کا زہر موجود ہے۔ اس نظامِ تعلیم کا حصہ بننے والی نسلوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کی اسیر ہو جاتی ہیں اور مسائل حیات کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ عام طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہوتا ہے اور مادی دنیا ان کی مقصود بن جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر طرف نفسانفسی، چھینا جھپٹی، دھوکہ دہی، لوٹ مار، انسان آزاری اور سنگ دلی کی جو فضا موجود ہے اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے وہ سب اس لادینی نظام تعلیم ہی کا نتیجہ ہے۔ اس نظام کو پوری طرح بدلے بغیر معاشرے کو کسی بھی طور ہمہ گیر فساد سے نہیں بچایا جا سکتا اس لیے کہ دنیا اور نفسی خواہشات کو مقصود بنانے کا سبق اگر دس پندرہ سال تک طالب کو ملے گا تو نفس پرستی اور مادہ پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ اور اس کے دین کے لیے طبعی مناسبت پیدا کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہے گا۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارا سرکاری نظام تعلیم ہو یا پرائیویٹ تعلیمی ادارے، سب مادیت اور نفسی خواہشات کو تیز سے تیز کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں اور بچوں کی نظری اور روحانی قوتوں کی بربادی کا موجب بھی۔ جب تک باصلاحیت افراد سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے ذریعہ نظام تعلیم میں اپنی پاکیزہ تہذیب کی روح کو شامل کرنے کے لیے کوشاں نہ ہوں گے تب تک ہمارا اجتماعی نظام فساد ہی سے دوچار رہے گا اور اصلاح کی ساری کوششیں ناکامی سے دوچار ہوں گی اور معاملہ چند افراد کی اصلاح سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔

یہ کتنی المناک بات ہے کہ اس چیلنج نے ہمارے معاشرے کے اجتماعی ضمیر کو مردہ کر دیا ہے اور حق و صداقت اور سلیقۂ انسانیت کی بات سننے سے بیزاری تک معاملہ پہنچ گیا ہے لیکن جدید تعلیم سے وابستہ دین دار افراد کی طرف سے اس محاذ پر رسمی نوعیت کی جزوی تبدیلیوں سے زیادہ کوئی کام نہیں ہو سکا اور نئے نئے ناموں سے قائم ہونے والے جدید تعلیمی ادارے لادینیت اور مادہ پرستی کے اسی زہر کو مزاج میں سرایت کرنے کا موجب بنے ہوئے ہیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر دلاور خان [۱]

سیرت النبی اور سماجی علوم

عصر حاضر کے جدید سماجی علوم کے فلسفہ اور نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا محور و مرکز عقل اور مادہ پرستی ہے اور یہی فکر و فلسفہ ان کی اوّل تا آخر قدرِ مطلق ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نصاب معرفتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عاری ہے، جس کی وجہ سے سند یافتہ افراد کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو رہی ہے جس کی بھیانک کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ معدودے چند کے سوا جس شخص کے پاس جتنی اعلیٰ سند ہے، اتنی ہی زیادہ وہ غریبوں سے فیس وصول کر کے جونک کی طرح ان کا خون پی رہا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے تو اتنا ہی زیادہ بدعنوانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیمی سند اور بدعنوانی لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان سند یافتہ افراد نے معاشرے میں مسموم فضا قائم کر دی ہے جس نے معاشرے کو کئی صدمات و مشکلات سے دوچار کر دیا ہے اور انفرادیت نے اجتماعیت پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔

سماجی علوم کی اہمیت سے کسی طرح بھی انکار ممکن نہیں، لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ موجودہ سماجی علوم نے انسانی معاشرے پر کئی منفی اثرات مرتب کیے ہیں جن سے ایک غیر معتدل و اخلاقی اقدار سے آزاد مادیت پرست معاشرہ جنم لے رہا ہے، جو اپنے حقوق سے آگاہ ضرور ہے مگر مقصدِ حیات کے اعلیٰ و ارفع مقصد سے بالکل کورا ہے۔ سماجی علوم کے منفی اثرات سے امتِ مسلمہ کی علمی، روحانی، سماجی، معاشی، سیاسی، اخلاقی اور تحقیقی اقدار روبہ زوال ہیں۔ امت کو لاحق ان سنگین مسائل کو حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

آخر اس سماجی ناسور اور المیے کی علت و سبب کیا ہے؟

اگر ہم اس سوال پر طائرانہ نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ ان سند یافتہ افراد میں خوفِ خدا اور حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فقدان پایا جاتا ہے، جبکہ حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی وہ قوتِ نافذہ ہے جو سند یافتہ فرد کو تہذیبِ نفس اور خدمتِ انسانیت پر مجبور کرتی ہے اور وہ سند کی منزل سے نکل کر

[۱] پرنسپل گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، ایجوکیشن سٹی، ملیر، کراچی

تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کے منصب پر فائز ہو جائے گا۔ اب وہ ایسا بے نفس ہو گا کہ خدمتِ انسانیت اور احترامِ انسانیت اس کا اوڑھنا بچھونا ہو گا۔

سماج کی ان اعلیٰ و ارفع اقدار کے حصول کے لیے ایک مربوط و منظم لائحہ عمل تشکیل دینے کی ضرورت ہے کہ سماجی علوم کے نصاب کو علمی، تحقیقی اور موٴثر انداز میں سیرت النبی ﷺ کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو موجودہ بے جان سماجی علوم میں ایک نئی روح بیدار ہو جائے گی جس کے نتیجے میں سماجی علوم کا ماہر مصطفوی اخلاق سے مزین ہو گا اور سیرتِ طیبہ کے چشمہ فیض سے ہدایت یافتہ اور تربیت یافتہ بھی ہو گا۔ اس میں اخلاقی اور مذہبی اقدار سے بے زاری کے بجائے ان سے رغبت کا جذبہ پیدا ہو گا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سماجی علوم میں دین و دنیا کا فرق معدوم ہوتا چلا جائے گا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، بشریات، قانون، حقوقِ انسانی، تعلیمیات اور اسی طرح کے دیگر سماجی علوم کا بنیادی ماخذ سیرت النبی ﷺ مان کر نصاب سازی کی جائے۔ سیرت النبی ﷺ کا دائرۂ کار محض چند مذہبی عنوانات تک محدود نہ کیا جائے، بلکہ سماجی علوم کے جتنے بھی جدید مضامین ہوں، ان سب میں سیرت النبی ﷺ کی عکاسی ہو۔ اس طرح سماجی علوم کے مادہ پرست نظریات کو سیرت یافتہ بنا کر ہی مسلم امہ کی علمی، روحانی، سماجی، معاشی اور سیاسی اقدار کا از سر نو احیاء ممکن ہے۔

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خدا داد

چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

ہے مملکت 'پاک' میں اِک طُرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

تعلیم و تربیت　　　　پروفیسر ملک محمد حسین

دینی مدارس - انسانی وسائل کا عظیم سرچشمہ

ان وسائل کو کیسے مفید تر بنایا جائے؟

روزنامہ 92 نیوز کی ٦ مئی کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ وفاق المدارس کے امتحان ۲۰۱۹ء میں ۷۱ ہزار ۱۴۴ حفاظ کرام پاس ہوئے جب کہ شہادۃ العالمیہ کے امتحان میں، جو ایم اے عربی اور اسلامیات کے مساوی ڈگری ہے، ۳لاکھ ۵۹ ہزار طلبہ کامیاب ہوئے۔ حفاظ کرام اور شہادۃ العالمیہ کی ڈگری حاصل کرنے والوں کی یہ تعداد صرف ایک وفاق یعنی وفاق المدارس العربیہ کی ہے جب کہ اس کے علاوہ چار اور وفاق بھی ہیں جن کے ساتھ ملحق مدارس سے طلبا حفظ قرآن اور شہادۃ العالمیہ کی سندات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح اگر اندازہ لگایا جائے تو پاکستان میں حفظ قرآن اور شہادۃ العالمیہ کی سندات حاصل کرنے والوں کی تعداد بالترتیب تین لاکھ اور ۸ لاکھ تک ہوسکتی ہے۔ انفرادی دینی مدارس اور مساجد بھی ہزاروں میں ہیں جہاں حفظ قرآن اور قرآن ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر ان سے حفظ قرآن کی تکمیل کرنے والوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو حفاظ کرام کی تعداد ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہے۔ قرآن کی تعلیم اور دینی علوم کی تعلیم کے اس فروغ کو سامنے رکھا جائے تو اللہ ربّ العزب کا شکر ادا کرنے کے علاوہ اور مسرت وانبساط کے دینی جذبات پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی پہلو سامنے نہیں آتا۔

لیکن اس ساری صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس پر غور ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ جن نوجوانوں کو ہم دینی تعلیم کی اس اعلیٰ سطح پر پہنچا رہے ہیں انہیں زندگی کی مادی دوڑ میں آگے بڑھنے کا کون سا راستہ مہیا کررہے ہیں؟ ان نوجوانوں کے پاس دینی علوم میں مہارت کے سوا کوئی اور پیداواری مہارت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندانوں کو سپورٹ کرسکیں۔ ان کے پاس یا تو مسجد کا امام اور خطیب بننے کی صلاحیت ہے یا دینی مدرسہ میں کام کرنے کی۔ اب یہ شعبہ پہلے ہی سیچوریشن (Saturation یعنی ضرورت سے زیادہ افراد کا حامل ہونا) کا

شکار ہے اور اس میں تنگ ودو کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ آپ کوئی جگہ تلاش کریں جہاں قرب وجوار میں کوئی مسجد یا مدرسہ نہ ہو اور کچھ لوگوں میں مذہبی تعصب پیدا کر کے انہیں اپنے ساتھ ملائیں اور مسجد یا مدرسہ کی بنیاد رکھ دیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کسی چلتے مدرسہ یا مسجد پر قبضہ کرنے کی راہ نکالیں۔ یہ راہیں اختلافی مسائل چھیڑنے سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح معاشرہ جو پہلے ہی مذہبی اختلافات کا گڑھ بنا ہوا ہے مزید اختلافی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ آپ ذرا اندازہ فرمائیں کہ ہم ہر سال لاکھوں مذہبی بے روزگار پیدا کر رہے ہیں اور یہ مذہبی بے روزگار اپنی حقیقی مجبوری کی وجہ سے معاشرے کو مذہبی بنیادوں پر عدم استحکام کا شکار کر رہے ہیں۔ ہم جب کہتے ہیں کہ ہر مسجد اور اس کا امام ایک علیحدہ فرقہ بن چکا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان بے چارے مذہبی بے روزگاروں کا وجود ہی اختلاف کا مرہونِ منت ہے۔ اپنے مقتدیوں اور مذہبی مریدوں کے ایک قابل ذکر جتھے کے بغیر ہمارے ان سند یافتہ مذہبی نوجوانوں کا مادی زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سماجی اور مذہبی مسئلہ کا حل کیا ہے؟ دینی مدارس ایک مفید اور مثبت خدمت کر رہے ہیں۔ بے سہارا، غریب اور سکولوں کالجوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہ کر سکنے والے والدین کے بچوں کو یہ دینی مدارس روٹی کپڑا جائے رہائش اور تعلیم مہیا کرتے ہیں اور اس طرح لاکھوں بے نوا اور غریب بچوں کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔ ریاست کے فرائض گویا یہ دینی مدارس ادا کر رہے ہیں اور ان دینی مدارس کی پشت پر وہ مخیر خواتین وحضرات ہیں جو محض اللہ کی رضا کی خاطر ان مدارس اور دینی جامعات کو سپورٹ کرتے ہیں۔ معاشرے میں خیر کا یہ عمل جاری رہنا چاہیے لیکن ان نوجوانوں کو جو اِن اداروں سے فاضل بن کر فارغ ہوتے ہیں انہیں پیداواری اور روزگار مہیا کرنے والی مہارتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ہر سال شہادۃ العالمیہ کی سند حاصل کرنے والے تمام فاضلین کو خصوصی طور پر تیار کردہ ٹیسٹ دیا جائے جس کا مقصد ان فاضلین کی عمومی قابلیت کو جانچنا ہو۔ اس ٹیسٹ کے نتیجے میں ۱۰ فیصد ٹاپ سکوررز کو ایم۔ ایس، ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے کا خصوصی انتظام کیا جائے۔ ریگولر مذکورہ کورسز سے پہلے ۶ ماہ کا انگریزی زبان کا ایک اعلیٰ اور مؤثر کورس کرایا

جائے اوراس کے بعد دو سال میں ایم ایس، ایم فل کے کورس کی تکمیل کرائی جائے۔ایم ایس، ایم فل کسی بھی سوشل سائنس میں مفید ہوسکتا ہے جن میں معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، تعلیمات، قانون، عمرانیات، نفسیات، کمپیوٹر سائنس وغیرہ شامل ہیں۔عربی اوراسلامیات بھی شامل رہیں گے۔ انگلش اور دیگر اعلیٰ تعلیم کے پروگراموں کے دوران تمام تعلیمی مصارف بشمول گزارہ الاؤنس حکومت مہیا کرے۔ چونکہ دینی مدارس میں زیر تعلیم اکثر نوجوان بہت ذہین ہوتے ہیں اس لیے اس حکمت عملی کو اپنانے سے معاشرے کو عربی اور اسلامیات کی مضبوط تعلیم کی بیگ گراؤنڈ رکھنے والے سوشل سائنسز کے میدان میں ایسے گوہر ہائے نایاب ملیں گے کہ معاشرے کی سماجی زندگی اور تعلیمی تحقیقی میدان کا رمثبت طریقے سے متاثر ہوگا۔

۲۔ مذکورہ بالا ٹیسٹ کے نتیجے میں ٹاپ ۱۰ فیصد سکوروز کو چھوڑ کر اگلے ۱۰ فیصد ٹاپ سکوررز کو حکومت اپنے خرچ پر ایک سال کا انگریزی زبان کا کورس اور ڈیڑھ سالہ بی ایڈ کا کورس کرائے اور ان فاضلین کو سکولوں، کالجوں اور دینی مدارس میں پڑھانے کے لیے تیار سمجھا جائے۔اس طرح جدید تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کو پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ معلمین دستیاب ہوں گے۔ نیز اس سے دینی مدارس کے فاضلین کی بیروزگاری پر قابو پانے میں مدد ملے گی اور معاشرے میں فرقہ واریت پر مبنی کھینچا تانی بھی کم ہوگی۔ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور حکومتی ادارے دینی مدارس کے خلاف سطحی سوچ اور تعصب سے باہر نکلیں اور خلوص کے ساتھ معاشرے کو مثبت اِن پُٹ دیں۔

۳۔ مذکورہ بالا ۲۰ فیصد فاضلین کو تعلیم اور تحقیق میں کھپانے کے بعد جو ۸۰ فیصد باقی فاضلیں بچیں گے انہیں پیداواری اور روزگار مہیا کرنے والی مہارتیں دینے کا اہتمام کیا جائے۔اس مقصد کے لیے نیوٹیک اور صوبائی ٹیوٹا کو متحرک کیا جائے کہ وہ تمام دینی مدارس کے ساتھ منسلک ٹیکنیکل اور ووکشینل تعلیم کا اہتمام کریں۔یہ ٹیکنیکل اور ووکشینل تعلیم پیرامیڈیکل، زراعت، فوڈ ٹیکنالوجی وغیرہ وغیرہ کی فیلڈ میں ہوسکتی ہیں نیز دینی مدارس کے فاضلوں کو طب یونانی، ہومیوپیتھک، فزیوتھراپی اور بعض دیگر شعبوں میں ڈپلوما، سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے مواقع دیے جائیں۔اس طرح یہ فاضلین جہاں اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہوں گے وہاں معاشرے کو دینی خدمات بھی مہیا کرسکیں گے لیکن معاشرے کے دست نگر نہیں ہوں گے۔

۴۔ ایک آخری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس میں داخلے کے لیے آٹھ جماعتیں پاس ہونے کے برعکس میٹرک پاس ہونا لازمی قرار دیا جائے۔ دینی مدارس خود بھی نارمل دینی کورس میں داخلے سے پہلے میٹرک تک پڑھانے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اس وقت ۵ سال سے ۱۶ سال تک لازمی تعلیم کا جو قانون ہے اس پر عمل کرنے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تمام بچے میٹرک تک یکساں نصاب کے تحت تعلیم حاصل کریں اور اس کے بعد شعبہ جاتی تقسیم ہو۔ تاہم میٹرک تک ناظرہ قرآن، ترجمہ قرآن اور منتخب احادیث کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات سب بچوں کے لیے لازمی ہو۔

ہم نے سطور بالا میں دینی مدارس کی تعلیم کو مفید تر بنانے، دینی مدارس کے فاضلین کو معاشرے میں ضم کرنے اور ایک خاص سطح تک یکساں نظام تعلیم نافذ کرنے کی تجاویز دی ہیں۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ ہماری ان معروضات پر غور کریں اور انہیں بہتر بنانے کے لیے ہماری رہنمائی کریں۔

بقیہ: مسلمانوں کی قومی تعلیم

اس واضح فائدہ کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے نوجوان ہاتھ سے محنت و کام کی عظمت اور اہمیت بھی محسوس کریں گے اور وہ بُعد اور علیحدگی دور ہو سکے گی جو اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ میں اور ان عوام میں ہے جو پیشہ ورانہ کاموں پر گزارا کرتے ہیں۔ ایک طالب علم کو مستقبل میں بہتر موقع فراہم کرنے کے علاوہ ان پیشوں کا اپنا معیار بھی بڑھے گا کیونکہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان محض تقلید نہیں کرے گا بلکہ ارتقاء و ایجاد کی جانب بھی قدم بڑھائے گا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ پیشہ ورانہ تربیت فنی تربیت کا متبادل ہے۔ یہاں جن اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تربیت دی جائے جس پر ایک طالب علم ہفتہ میں صرف چند گھنٹے صَرف کرے گا جو ایک تھکے ہوئے ذہن کو اکتانے کی بجائے تسکین پہنچائے گی، جو چودہ برس کی مدت میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو ایک ممتاز کاریگر بنائے گی تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی روزی کما سکے۔

تعلیم و تربیت

علامہ محمد خلیل الرحمن قادری[۱]

دینی مدارس کی مرکزی تعلیمی دھارے میں شمولیت
تجزیہ و تجاویز

دینی مدارس نہ تو سرکاری سکولوں اور کالجوں کی طرح ہیں کہ ان کی عمارتوں، ساز و سامان اور انتظامی اخراجات کی تمویل کا بندوبست سرکار کرتی ہو۔ یہ سب کچھ مدارس کے منتظمین مخیر حضرات کے تعاون سے خود کرتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے دینی مدارس پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کی طرح بھی نہیں ہیں جو تجارتی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور اپنی خدمات کا معاوضہ طلبا و طالبات سے فیسوں کی صورت میں وصول کرتے ہوں بلکہ ان کی آمدن کا انحصار ان فیسوں پر ہی ہوتا ہے اور اسی سے وہ نہ صرف اپنے انتظامی اخراجات پورے کرتے ہیں بلکہ مالکان اپنے لیے منافع بھی کماتے ہیں۔ ان کے برعکس دینی مدارس اپنے طالب علموں سے فیسیں وصول نہیں کرتے بلکہ انہیں بورڈنگ اور طعام کی سہولیات بھی بلا معاوضہ فراہم کرتے ہیں۔

محکمہ تعلیم میں رجسٹریشن

اس تمہیدی گفتگو کے تناظر میں سب سے پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ محکمہ تعلیم میں دینی مدارس کی رجسٹریشن صاف ظاہر ہے کہ سرکاری ادارے کے طور پر تو نہیں ہوسکتی اور نہ ہی پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کی طرز پر ہوسکتی ہے بلکہ انہیں ایک الگ کیٹگری میں رکھ کر ان کی رجسٹریشن کا طریقہ کار وضع کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ مدارس کو دو کیٹگریز میں رجسٹر کیا جائے۔ پہلی کیٹگری میں ان مدارس کو رجسٹر کیا جائے جو دینی اور عصری دونوں علوم پڑھا رہے ہوں۔ دوسری کیٹگری میں ان مدارس کو رجسٹر کیا جائے جن کی پوری توجہ علوم شرعیہ پڑھانے پر ہو۔ اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس یکسوئی سے ہی راسخ علما تیار ہوسکتے ہیں۔ یہ تقسیم مدارس کو قومی دھارے میں لانے کے خلاف نہیں ہے

[۱] ناظم اعلیٰ، جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن، لاہور

کیونکہ ایسی تقسیم کئی دیگر حوالوں سے نجی سکولوں اور کالجوں میں بھی موجود ہے مثلاً انگلش اور اُردو میڈیم سکولوں کی تقسیم اور پرائمری مڈل اور سکینڈری سطح کے سکولوں کی تقسیم وغیرہ۔

۲۔ دینی مدارس چونکہ تجارتی یا کمرشل ادارے نہیں اس لیے ان کی رجسٹریشن پر کوئی خرچہ نہیں ہونا چاہیے، نہ سرکاری اور نہ ہی اس رشوت کی صورت میں، جو محکمہ تعلیم کے افسران پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے لیتے ہیں۔

۳۔ اس رجسٹریشن کے بعد ان نامعقول فارموں سے منتظمینِ مدارس کی جان چھوٹ جانی چاہیے جن کو پکڑ کر مختلف ایجنسیوں کے لوگ مدارس میں آوارد ہوتے ہیں اور انہیں ہراساں کرتے ہیں۔ ان فارموں میں منتظمین کے بہن بھائیوں اور بچے بچیوں کے بارے میں ایسے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب کا مالک بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ آخر اس نے اس دینی مشن کی خدمت کر کے کون سا گناہ کرڈالا ہے؟

۴۔ اس رجسٹریشن کے بعد مدارس کا بورڈ آف انٹرمیڈیٹ وسکینڈری ایجوکیشن اور یونیورسٹیوں کے ساتھ الحاق آسان شرائط پر ہوجانا چاہیے یا کم از کم ان کے طلبا وطالبات کو داخلی امیدوار کے طور پر امتحانات دینے کی اجازت بلا تامل مل جانی چاہیے تاکہ مدارس کے طلبا حقیقت میں قومی دھارے میں شامل ہوجائیں اور ان کی امتحانی کامیابیاں بھی نمایاں طور پر سامنے آسکیں۔

۵۔ دینی مدارس علوم شریعہ کے نصابات تیار کرنے اور انہیں اختیار کرنے میں آزاد ہوں البتہ عصری علوم میں حکومت کے دیئے گئے نصابات کی پابندی کی جاسکتی ہے۔

۶۔ جس طرح محض محکمہ تعلیم کے ساتھ رجسٹریشن کسی بھی پرائیویٹ ادارے کی آزادانہ انتظامی پالیسی پر اثرانداز نہیں ہوتی اسی طرح دینی مدارس پر بھی اس حوالے سے کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔

دینی مدارس کی نگرانی

دوسرا اہم اور حساس پہلو دینی مدارس کی نگرانی سے متعلق ہے۔ اصولی طور پر تو ان کے لیے معمول کی مانیٹرنگ ہی کافی تھی لیکن روس کے خلاف جہاد میں مجاہدین کی فراہمی کے لیے بعض مدارس کے ساتھ ریاستی سطح پر تعاون کیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس تعاون کے پیچھے

امریکہ کھڑا تھا۔ اس کے بعد دنیا بھر سے جمع ہونے والے ان ''مجاہدین'' کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر نائین الیون اور امریکہ کی اتحادی افواج کے ساتھ افغانستان پر چڑھائی نے حالات کو تیزی سے بدل دیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا جس میں پاکستان بدستور امریکی کیمپ میں ہی رہا۔ پاکستانی کے قبائلی علاقہ جات میں ریاست پاکستان کے خلاف نفرت نے جنم لیا اور وطن عزیز کو بدترین دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی چونکہ کچھ مدارس کو روس کے خلاف استعمال کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے مفادات کی خاطر اپنا بیانیہ تبدیل کیا اور تمام تر دہشت گردی کا ذمہ دار بھی بلاامتیاز تمام دینی مدارس کو قرار دینے لگے اور ہماری حکومتوں سے دینی مدارس کے خلاف سخت کارروائیوں کے مطالبے کرنے لگے۔ ان مطالبوں میں وقت گزرنے کے ساتھ شدت آتی چلی گئی۔ اوپر سے کل کے مجاہدین اور آج کے دہشت گردوں کے بعض مدارس کے ساتھ رابطوں بلکہ وہاں پناہ گزین ہونے کی خفیہ اطلاعات کی خبریں بھی سامنے آنے لگیں۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان چند مدارس کی موثر نگرانی کر کے حقائق تک رسائی حاصل کی جاتی۔ اگر حقائق تقاضا کرتے تو ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جاتی۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان مدارس کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

اب چونکہ امریکہ اور اس کے اتحادی دینی مدارس کے درپے ہیں اس لیے حکومت کی مجبوریاں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں اور وہ مدارس کو قومی دھارے میں لانے کے نام پر اپنی ترجیحات کی بناء پر فیصلہ کن اقدام کرنے کی تیاری میں نظر آتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ترجیحات بھی امریکی مطالبات کی روشنی میں متعین کی گئی ہیں۔ ان ترجیحات کا ایک پہلو دینی مدارس کی نگرانی بھی ہے۔ چونکہ مدارس کی بہت بڑی تعداد کا دامن صاف ہے اس لیے انہیں اس نگرانی پر اصولی اعتراض نہیں ہونا چاہیے البتہ حکومت کو بھی مدارس کے جائز تحفظات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں کچھ تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ بیرونِ ملک ایجنسیوں اور حکومتوں سے ملنے والی فنڈنگ کی کڑی نگرانی کی جائے۔ بنکوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایسی رقوم کی ترسیل سے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کو آگاہ کریں۔ اگر کسی مدرسے کے اکاونٹ میں غیر معمولی رقم (جس کا تعین باہم مشاورت سے کیا جاسکتا ہے) نقد بھی جمع ہو تو اس سے بھی اسٹیٹ بنک آف پاکستان کو آگاہ کیا جائے۔

۲۔ اوورسیز پاکستانی جن رقوم کی مدارس کی معاونت کے لیے ترسیل کریں ان کو استثنیٰ

حاصل ہو۔ان رقوم کی بھی زیادہ سے زیادہ سالانہ حد باہمی مشاورت سے طے کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مدارس کے حسابات کا سالانہ آڈٹ کرایا جائے۔ اس کے لیے حکومت کو ایفائیڈ اکاونٹنٹ کی تنخواہ کا بوجھ خود اٹھائے جو ہر جامعہ کے حسابات اکاؤنٹنگ کے مسلمہ اصولوں کے مطابق تیار کرے تاکہ آڈٹ میں دشواری نہ ہو۔ اگر حکومتی خزانہ یہ بوجھ اٹھانے کا متحمل نہ ہو یا امریکی ایجنڈہ در پردہ کچھ اور ہو تو حکومت کم ازکم مدارس میں پہلے سے موجود سٹاف کو تربیتی کورس کے ذریعے ان کی استعداد کار بڑھانے میں تو اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔حکومت یہ بھی کرسکتی ہے کہ آڈٹ کمپنی کی فیس کا بوجھ مدارس پر نہ ڈالے اور سرکاری خزانے سے اس کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔

۴۔ مدارس کو اپنے ملکی ڈونرز کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ جب یہ عطیات حکومت کی وساطت سے جمع نہیں ہوتے تو حکومت کو ان عطیات دہندگان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ یہ عطیات دہندگان ہراساں ہوجائیں اور مالی تعاون سے پیچھے ہٹ جائیں۔ جب آڈٹ لازم ہوگا تو مدارس کے پاس تمام تر عطیات کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ اگر آڈیٹر کو کوئی اعتراض ہوگا تو وہ اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کرسکتا ہے۔

۵۔ تمام مدارس کو ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے انکم ٹیکس سے استثنیٰ (Tax exemption) دی جائے اور ان کے عطیات دہندگان کو یہ سہولت حاصل ہو کہ وہ مدارس کو دیئے گئے عطیات پر ٹیکس Rebate کلیم کرسکیں۔ اس طرح جو ڈونر فائلر ہوگا وہ خود ہی اپنی طرف سے دیئے گئے عطیات کو ظاہر کردے گا اور حکومت کا تجسس بھی ختم ہوجائے گا اور نہ ہی مدارس کو ان کے تعاون سے محروم ہونا پڑے گا۔

۶۔ نگرانی کا ایک پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ کوئی مدرسہ دہشت گردی میں توملوث نہیں۔ اس کا طریق کار تو یہی ہے کہ ایجنسیاں اپنے طور پر مشکوک مدارس پر نظر رکھیں اور جہاں شواہد ملیں وہاں بلاامتیاز قانونی کارروائی کی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان مشکوک مدارس کے منتظمین کا Counter Terrorism Check کروالیا جائے۔ جن کا دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہونا پایہ ثبوت تک پہنچ جائے انہیں مدارس کی انتظامیہ سے الگ کردیا جائے اور مدرسہ پر کڑی نظر رکھی جائے۔ اگر اصلاح احوال نہ ہو تو مدرسہ کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی مسئلہ پر پرامن

احتجاج کرنے والوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے ان پر حکومت کی طرف سے دہشت گردی کا جو الزام عائد کر دیا جاتا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حکومت کے خلاف مسلح خروج کو دہشت گردی قرار دیا جا سکتا ہے یا معروف معنی میں دہشت گردی کی کارروائیاں کروانا یا ایسی کارروائیوں کی پشت پناہی کرنا ضرور قابل گرفت ہے۔

۷۔ انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ منافرت کی روک تھام کے لیے کئی کوششیں مدارس اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں جن کے نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ جہاں تک مدارس کے نصاب کا تعلق ہے تو اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جو فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دے۔ ہاں کچھ مدارس کے منتظمین، اساتذہ اور معاونین کے ذاتی رویے نفرت انگیزی کا باعث بن سکتے ہیں۔ صوبائی سطح پر تشکیل دیئے جانے والا متحدہ علما بورڈ ایسے واقعات کے سد باب کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پلیٹ فارم کو مؤثر بنایا جائے۔ اس میں غیر سیاسی جید علماء کرام کو شامل کیا جائے اور بورڈ کو ضروری حد تک با اختیار بنایا جائے۔

دینی مدارس کی مالی معاونت

عرصہ دراز سے دینی مدارس مخیر حضرات کے مالی تعاون سے چل رہے ہیں۔ اب حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد تیس ہزار ہے۔ اگر فی مدرسہ اوسطاً پندرہ اساتذہ اور انتظامی عملہ بھی شمار کیا جائے تو جملہ مدارس کے اساتذہ کی تعداد چار لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ بیشتر مدارس محدود وسائل کی وجہ سے سرکاری سطح پر رائج تنخواہیں نہیں دے رہے۔ اگر حکومت ان کو تنخواہیں دینے کی ذمہ داری اٹھاتی ہے تو وہ اساتذہ کو کس گریڈ اور سکیل کے مطابق تنخواہیں دے گی؟ اگر اوسطاً ہر استاذ کو پچیس ہزار ماہوار بھی دیا جائے تو صرف تنخواہ کی مد میں گیارہ ارب روپے ماہوار درکار ہوں گے۔ سالانہ کا حساب خود لگا لیں۔ پھر طعام اور دیگر انتظامی اخراجات الگ ہیں۔ یہ اخراجات برداشت کرنا حکومت کے بس میں نہیں ہے۔ ہاں اگر امریکہ اور اس کے اتحادی یہ امداد فراہم کر دیں تو الگ معاملہ ہے البتہ ہماری دانست میں وہ پہلے ہی انسداد دہشت گردی کے لیے خطیر رقوم حکومت پاکستان کو دے چکے ہیں لہٰذا ان سے مزید بڑی توقعات وابستہ کرنا غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ یہ بات بھی بے حد اہم ہے کہ پہلے ہی بڑے فوجی آپریشنز کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا ہے لہٰذا امریکہ اور

اس کے اتحادیوں کے لیے اس میں کیا کشش ہوگی کہ وہ مدارس کے لیے بڑی گرانٹ دیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مدارس کے منتظمین کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ وہ حکومت سے ایسی امداد حاصل کریں جس کے عوض انہیں اپنے مدارس کی تدریسی و انتظامی خودمختاری گروی رکھنی پڑے۔ ویسے بھی یہ عمل ایک طرح سے مدارس کو قومیانے کے مترادف ہوگا جو کہ قطعاً مبنی برجواز نہیں ہے۔ مدارس کو وقف کی جانے والی اراضی اور اس پر ہونے والی تعمیرات کے قانونی طور پر کسٹوڈین منتظمین ہی ہوتے ہیں۔ اگر انہیں نئی قانون سازی کے ذریعے بے دخل کیا جائے گا تو ملک کے طول و عرض میں انارکی پھیل جائے گی۔ لہٰذا حکومت جو اس وقت پہلے ہی مشکلات میں ہے، وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل صوبائی حکومتوں کی طرف سے دینی مدارس کو بیت المال کے ذریعے زکوٰۃ کی مد میں مالی معاونت فراہم کی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ رقم مدارس کے کل اخراجات کا بمشکل بیسواں حصہ بھی نہیں بنتی تھی پھر بھی اس کا حصول تب ممکن ہوتا جب محکمہ کے لوگوں کو اس میں سے حصہ دیا جاتا۔ کئی ذمہ دار اور محتاط علما نے تو اس قباحت کے باعث اس مالی معاونت کو لائق اعتنا ہی نہ سمجھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ معاونت بھی خاص خاص مدارس کے حصے میں آتی تھی، فیضِ عام نہیں تھا۔ بعد میں اسے بھی بند کر دیا گیا۔ الغرض حکومتی سطح پر مدارس کے ساتھ مالی تعاون کا یہ سلسلہ کبھی بھی کامیاب نہیں رہا اور نہ ہی اب اس کی امید ہے۔ اگر حکومت مدارس کو مالی معاونت فراہم کرنے میں مخلص ہو تو چند تجاویز اس حوالے سے بھی پیش خدمت ہیں:

۱۔ مدارس کو بجلی اور گیس کے بلز رعایتی نرخوں پر بھیجے جائیں۔ اس بات کا حکومت کو بھی بخوبی علم ہے کہ مدارس میں تجارت نہیں ہوتی اور وہاں بھی طلبا ہی رہائش پذیر ہوتے ہیں جن سے رائج نرخوں کے مطابق گیس اور بجلی وغیرہ کے بلز چارج کرنا ان پر مالی بوجھ بڑھانے کے مترادف ہے۔ اس کام کے لیے اگر حکومت بجلی چوری اور لائین لاسز میں کمی کر لے تو مدارس کی مجوزہ خطوط پر مالی معاونت کر سکتی ہے اور خزانے پر اس کا کوئی بوجھ بھی نہیں ہوگا۔

۲۔ پس ماندہ علاقوں کے کئی مدارس میں طلباء کے لیے متعدد سہولیات کا فقدان نظر آتا ہے۔ حکومت ان سہولیات کی فراہمی کے ذریعے بھی مدارس کی مالی مدد کر سکتی ہے۔ مثلاً کمپیوٹر

لیب، سکیورٹی کیمرے، الیکٹرک واٹر کولر، صاف پانی کی فراہمی کے لیے فلٹریشن یونٹ۔ مقامی آبادی بھی اس سے استفادہ کرسکتی ہے۔ یو پی ایس، ڈیزرٹ کولر، جنریٹر، کتب خانہ اور ضروری فرنیچر وغیرہ۔ جہاں جس سہولت کی کمی ہو وہ فراہم کی جاسکتی ہے۔

۳۔ اساتذہ کے لیے سرکاری ملازمین کی طرز پر اولڈ ایج بینیفٹس اسکیم، پراویڈنٹ فنڈ بینوویلنس فنڈ وغیرہ کا اجرا کیا جاسکتا ہے جبکہ مدارس کی جگہ حکومت ایمپلائر کے حصے کا کانٹری بیوشن ادا کرے۔ یہ پوری تنخواہ دینے کے مقابلے میں پچاسواں حصہ بھی نہیں ہوگا البتہ اس کے فوائد یقینی ہوں گے۔

۴۔ دینی مدارس کے اساتذہ کو ہیلتھ انشورنس کارڈ ترجیحی بنیادوں پر دیئے جائیں کیونکہ محدود مالی وسائل کے سبب ان کا شمار مستحق ترین افراد میں ہوتا ہے۔

۵۔ جو مدارس حکومت سے مالی معاونت لینا چاہیں ان کو یہ سہولت پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کی طرز پر صوبائی سطح پر قائم ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ذریعے دی جاسکتی ہے۔ جس طرح کے قواعد وضوابط پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کے لیے بنائے گئے ہیں اس سے ملتے جلتے، مدارس کے تناظر میں، مدارس کے لیے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ اس میں سیاسی پسند یا ناپسند کا دخل نہ ہو۔ یہ امداد میرٹ پر لگے بندھے ضابطوں کے مطابق شفاف طریقے سے دی جائے تو مدارس کی بہتری ہوسکتی ہے۔

۶۔ ہائیر ایجوکیشن کے حصول کے لیے اساتذہ کے بچوں کو میرٹ پر مالی وظائف جاری کیے جاسکتے ہیں۔

۷۔ جہاں تک مدارس کے انتظامی معاملات کا تعلق ہے تو اس کے لیے بھی مدارس کی مشاورت سے مثالی قواعد وضوابط بنائے جاسکتے ہیں اور انہیں مدارس میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ قواعد وضوابط این جی اوز اور امداد باہمی کے اداروں کے حوالے سے پہلے ہی نافذ ہیں۔ ایک خاکہ ہم نے بھی اس حوالے سے تیار کر رکھا ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر یہ مثالی قواعد وضوابط تحریر کیے جاسکتے ہیں اور انہیں مدارس کی مشاورت سے نافذ العمل بنایا جاسکتا ہے۔

اگر حکومت درج بالا اقدامات کرلے تو مدارس کی مالی معاونت میں اس کی سنجیدگی واضح ہوجائے گی اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوں گے۔ بصورت دیگر اسے بھی ایک کروڑ

لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنے یا کے پی میں مساجد کے ائمہ اور خطبا کو سرکاری خزانے سے تنخواہیں ادا کرنے کے دعوؤں کی مثل ہی سمجھا جائے گا اور حکومت اور مدارس کے مابین اعتماد کا فقدان ہی رہے گا۔

نصابات کے حوالے سے ایک اشکال کا جائزہ

مدارس کے نصابات کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ انجینئر زیا ڈاکٹرز کیوں نہیں پیدا کررہے؟ اگر تو ایسا کہنے والوں کی مراد یہ ہے کہ چھ سالہ درس نظامی کی بجائے طالب علم کو میٹرک کے بعد دو سال کا نصاب پڑھایا اور اس عرصے میں اسے انجینئر نگ یا میڈیکل میں ایف ایس سی کرادی جائے تو یہ بات قابل فہم ضرور ہے لیکن اس پر عمل آمد کئی حوالوں سے مشکل ہے۔

سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ ایسا دو سالہ کورس، وہ بھی ایف ایس سی کے ہمراہ، مدارس کے دائرہ کار سے ہی باہر ہے کیونکہ بنیادی طور پر تو یہ درس نظامی کے علوم وفنون پڑھانے اور سکھانے کے ادارے ہیں۔ اس لیے ان کے نصابات چھ سالہ یا اس سے بھی زائد دورانیہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طلباء کو سوشل سائنسز میں گریجوایشن کرانا اگرچہ مشکل کام ہے لیکن بہت سے مدارس نے اسے شروع کر رکھا ہے۔ کمپیوٹر کورسز بھی کرائے جارہے ہیں۔ دو سالہ کورس سے عالم دین تیار نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس کا بہتر حل یہ ہے کہ یہ کام کالجز کے سپرد کر دیا جائے۔ علماء انہیں دو سالہ نصاب مرتب کر دیتے ہیں جسے پڑھنے والے طالب علم کو عقائد و اعمال صالحہ اور بنیادی احکام شریعت کا ضروری حد تک علم ہو جائے گا۔ مزید برآں تمام اصول وفنون کی مبادیات سے آگاہی حاصل ہو جائے گی۔ اسے سرکاری کالجز میں رائج کر دیا جائے تو شاید مقررہ اہداف کسی درجے میں حاصل ہو جائیں اور مدارس اپنے دائرے میں رہتے ہوئے بدستور کام کرتے رہیں۔

پاکستان کے تناظر میں یہ توقع رکھنا کہ مدارس سے ایک طالب علم پختہ عالم دین اور اس کے ساتھ انجینئر یا ڈاکٹر بن کر بھی نکل سکتا ہے ایک اچھی خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا درج ذیل وجوہ کی بناء پر قریب قریب ناممکن ہے:

ا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ سرکاری و نجی کالجز میں بھی انجینئر نگ اور میڈیکل کی تعلیم نہیں دی

جاتی بلکہ اس کے لیے الگ یونیورسٹیز اور کالجز بنائے گئے ہیں۔ کیا حکومت مدارس کو میڈیکل کالج اور انجینئر نگ یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے تیار ہو جائے گی جبکہ نجی سطح پر بھی اس کے لیے کڑی شرائط ہیں؟ اگر کوئی یہ کہے کہ طلباء یہ تعلیم موجود میڈیکل کالجز اور انجینئر نگ یونیورسٹیز سے ہی حاصل کریں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدارس کا اس میں کیا کردار رہ جائے گا؟ اور مدارس پر ڈاکٹرز یا انجینئرز بنانے کی توقعات کیوں وابستہ کی جارہی ہیں؟

۲۔ سرکاری میڈیکل کالج اور انجینئر نگ یونیورسٹیز میں داخلے کے لیے میرٹ ہوتا ہے وہ سرکاری کالجز جہاں ایف ایس سی پری میڈیکل اور پری انجینئر نگ کی معیاری تعلیم دی جاتی ہے ان کے بھی چند فی صد طلباء اس میرٹ پر پورے اترتے ہیں۔ اس کے بعد چند فی صد نجی کالجز میں کھپ جاتے ہیں اور ان کے والدین کو بھی لاکھوں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں مدارس کو اس مشقت میں ڈالنے کی کیا تک بنتی ہے کہ وہ ان کے لیے چھ سالہ نصابات کو بھی دو سالہ نصاب میں بدلیں اور طلباء کو پری میڈیکل اور پری انجینئر نگ کی تعلیم بھی دیں جس کے نتیجے میں شاید ان کے چند فیصد طلباء تو میرٹ پر داخلہ لینے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اس خصوصی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے تمام مراحل میں ان کا کوئی کردار سرے سے ہی نہ ہو۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مدارس میں حصول علم کے لیے داخل ہونے والوں کی اکثریت معاشی طور پر کمزور طبقے سے ہوتی ہے لہٰذا اگر انہی سرکاری میڈیکل کالجز یا انجینئر نگ یونیورسٹیز میں داخلہ مل بھی جائے تو کیا وہ ان کے اخراجات کا بوجھ اٹھالیں گے؟

الغرض یہ نا قابل عمل تجویز ہے اور مدارس کی کوششوں کا رُخ موڑنے کے مترادف ہے۔ ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل متعدد طلباء زندگی کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ اب یونیورسٹیز کو بھی علوم عربی اور علوم اسلامیہ میں ہائر ایجوکیشن کی سطح پر تدریس کے لیے اساتذہ انہی مدارس سے میسر آرہے ہیں۔ کئی وکالت کر رہے ہیں اور کئی افواج پاکستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بعض ایک تو سی ایس ایس میں بھی کامیاب ہوئے اور بیوروکریٹ بنے۔ سافٹ ویئر انجینئر نگ میں بھی آگے بڑھے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ مدارس سے فراغت کے بعد وہ متنوع تعلیم کو مزید کتنا وقت دے سکتے ہیں جبکہ مدرسہ کے آخری سالوں میں ہی وہ عملی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں کیونکہ ان کے والدین کی بھی ان سے یہی توقع ہوتی ہے۔

ہمارے دینی مدارس /ڈائیلاگ

ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کو مرکزی تعلیمی دھارے میں لانا مسئلے کا حل نہیں

دینی مدارس اصلاح اور تبدیلی کا فیصلہ خود کریں

اس کے لیے تجاویز پیشِ خدمت ہیں

مضمونِ سابق میں علامہ خلیل الرحمن قادری صاحب کی تجاویز اچھی اور قابل غور ہیں لیکن ہم اس موضوع کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اصل مسئلہ دینی مدارس کو تعلیم کے مرکزی تعلیمی دھارے میں لانے (Main Streaming) کا نہیں ہے بلکہ وحدتِ تعلیم کا ہے یعنی جدید تعلیم مذہبی تعلیم وتربیت سے عاری ہے اور مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہے اور دینی مدارس دنیاوی وعصری علوم سے اعتناء نہیں کرتے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی دھاروں کی خامیوں کو دور کر کے (یعنی ان کی ثنویت یا Dichotomy ختم کر کے) ان کو ایک موحد نظام تعلیم میں سمویا جائے۔

اگر بات صرف دینی مدارس کی مین اسٹریمنگ کی کی جائے کہ انہیں موجودہ جدید تعلیمی دھارے میں سمویا جائے تو معاف کیجیے گا یہ تو سیدھا سادہ دینی مدارس کے خاتمے کا پروگرام ہے کیونکہ جدید تعلیم مسلمہ طور پر مغرب زدہ ہے۔ حکمرانوں اور بیوروکریسی کو اپنی تعلیم وتربیت، مفادات اور مغرب زدگی کی بناء پر دینی تعلیم اور اس کے فروغ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ماضی میں اس طرح کی جتنی کوششیں بھی ہوئیں اس کے نتیجے میں دینی مدارس ختم ہو گئے یا برائے نام کاغذوں میں رہ گئے (جس کی ایک مثال تو جامعہ عباسیہ بہاولپور کی ہے اور پنجاب کے محکمہ اوقاف کے دینی مدارس کا ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے) لہٰذا دینی مدارس کی مین اسٹریمنگ کا نتیجہ حتماً یہی نکلے گا کہ دینی مدارس بتدریج غیر مؤثر اور غیر فعال ہوتے چلے جائیں گے اور یہی ہمارے حکمرانوں کے آقایانِ ولی نعمت یعنی مغرب وامریکہ چاہتا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ دینی مدارس اپنی اصلاح خود کریں، اپنا نظام خود بدلیں اور جہاں ضرورت ہو وہاں متحد ہو کر اور دباؤ ڈال کر حکومت سے اپنے مطالبے منوائیں اور کسی مغرب زدہ مین اسٹریم کا حصہ بننے کی بجائے خود مین اسٹریم بن جائیں۔ ہم قارئین کو یاد لائیں کہ ماضیٔ قریب کے ہمارے ایک فاضل بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے برصغیر کے نظام تعلیم

پر اپنی معرکہ الآراء کتاب کے آخر میں وحدت تعلیم کا یہی تصور پیش کیا ہے کہ ہمارے دینی مدارس کو چاہیے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ والے درس نظامی کو اپنائیں (کہ برصغیر سے مسلم حکومت کے خاتمے اور انگریزوں کے ہاتھوں مسلم نظام تعلیم کے انہدام کے بعد دیوبند ماڈل نے جو نظام تعلیم وضع کیا وہ ایک وقتی مجبوری تھی) ملا نظام الدینؒ کا تجویز کردہ نصاب (جنہوں نے نہیں دیکھا وہ ہماری کتاب ''ہمارا دینی نظام تعلیم'' کے شروع میں دیکھ لیں) دینی علوم کے ماہرین اور متخصصین تیار کرنے کا نصاب نہیں تھا بلکہ معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن تیار کرنے کا نظام تھا جس میں مذہبی علوم (یعنی قرآن وحدیث وغیرہ) کا حصہ بہت تھوڑا تھا۔ یہ دراصل ''مین اسٹریم'' کا نصاب تھا اس کے بعد کچھ طلباء مذہبی علوم میں تخصص بھی کر لیتے تھے۔ اس وقت بھی یہ دونوں باتیں ممکن ہیں یعنی دینی مدارس اگر چاہیں تو یہ کہ وہ خود مرکزی تعلیمی دھارا بن جائیں اور مسلم معاشرے اور ریاست کو چلانے والے کارکن بھی پیدا کریں اور دین کے متخصص و ماہر علماء بھی تیار کریں۔ اس کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ دینی مدارس اپنے مقاصد تعلیم میں تحریراً طے کریں کہ انہوں نے صرف مدارس اور مساجد کے لیے متخصص علماء ہی تیار نہیں کرنے بلکہ مسلم معاشرے اور ریاست کو چلانے کے لیے افرادِ کار بھی تیار کرنے ہیں اور عامۃ المسلمین کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی کرنا ہے۔

۲۔ دینی مدارس صرف مڈل پاس طلبہ کو داخلہ دیں اور بچوں کی مڈل تک تعلیم کا انتظام خود کریں اور اس میں بچوں کو جدید علوم کے ساتھ دینی علوم کی خصوصی تعلیم بھی دیں اور ان جماعتوں کی نصابی کتابیں خود تیار کرائیں اور بچوں کی اسلامی تربیت بھی کریں۔

۳۔ دینی مدارس حکومت سے یہ مطالبہ منوائیں کہ میٹرک اور ایف اے میں جس طرح سائنس، آرٹس اور کمپیوٹر وغیرہ کے تخصص اس وقت منظور شدہ ہیں، اسی طرح علوم اسلامیہ کا تخصص بھی وہ حکومت سے (یا انٹر بورڈ کمیٹی سے) منظور کرائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جدید علوم کا بوجھ میٹرک ایف اے میں اسلامی علوم کے طلبہ پر کم ہو جائے گا۔ نیز وہ یہ کریں کہ جدید علوم کی کتابیں بھی خود تیار کرائیں تاکہ طلبہ مغرب زدگی سے بچ سکیں۔ یاد رہے کہ اس وقت بعض حکومتی بورڈز نے ایف اے میں 'درس نظامی گروپ' رکھا ہوا ہے۔ گویا مدارس کو صرف میٹرک کے لیے اس کا مطالبہ کرنا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دینی مدارس مل کر اپنا ایک ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ منظور کرا لیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کیونکہ دو پرائیویٹ بورڈ پہلے منظور ہو

چکے ہیں اور علماء کرم اگر مل کر فیصلہ کر لیں تو قوم ان کو ضروری مالیات بھی فراہم کر دے گی، ان شاء اللہ۔

۴۔ باقی کے چار سالوں میں، جن میں اس وقت عالیہ اور عالمیہ ہوتا ہے، جسے ایچ ای سی، بی اے اور ایم اے (یا چار سالہ بی ایس آنرز) کے برابر تسلیم کرتی ہے، ان میں دینی مدارس دو راستے بیک وقت اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے طلبہ علوم اسلامیہ میں تخصص کریں اور دوسرے یہ کہ عمرانی علوم میں تخصص کریں۔ ہم زور دے کر کہتے ہیں کہ عمرانی علوم میں دینی تناظر میں تخصص گویا علوم اسلایہ میں ہی تخصص ہے کیونکہ معاشیات، سیاسیات، نفسیات، فلسفہ، تاریخ، تعلیم، قانون وغیرہ کا اسلامی تناظر میں مطالعہ ہماری رائے میں ہماری علمی روایت بھی ہے اور اس وقت ہمارے معاشرے کی ایک شرعی ضرورت بھی ہے۔ اور ایف اے میں چونکہ عمرانی علوم کا ایک مضمون ان کے لیے لازمی ہوتا ہے تو وہ اس مضمون میں اسلامی تناظر میں بی اے اور ایم اے (چار سالہ بی ایس آنرز) آسانی سے کر سکیں گے اور ملک وقوم کے علاوہ اسلامی علوم کی بھی خدمت کریں گے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مدارس اس مضمون کی نصابی کتابیں خود تیار کرائیں تا کہ ان کے طلبہ مغرب زدگی کے زہر سے بچ سکیں اور عمرانی علوم کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کر سکیں۔

۵۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کا انتظام بھی بعض بڑے مدارس خود کریں اور یہ نہ صرف اسلامی علوم میں ہوں بلکہ عمرانی علوم (مع اسلامی تناظر) میں بھی ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دینی مدارس مل کر ایک یونیورسٹی کا چارٹر لے لیں اور سارے مدارس کا اس سے الحاق کر لیں۔ ہم دینی مدارس کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ ممکن ہے اور اگر وہ مل جائیں اور متحد ہو کر قوم سے اس غرض سے مادی وسائل کی اپیل کریں تو ہمیں یقین ہے قوم ان کو مایوس نہیں کرے گی۔

۶۔ اگر دینی مدارس اس طرف بڑھنے کا فیصلہ کریں تو تحریک اصلاح تعلیم کے ماہرین ہر مرحلے پر ان کی بلا معاوضہ خدمت کے لیے تیار ہوں گے، ان شاء اللہ۔

اس طریقے سے دینی مدارس کو نہ تو موجودہ جدید تعلیمی دھارے میں ضم ہونا پڑے گا اور نہ ان کا وجود خطرے میں پڑے گا بلکہ وہ اپنی آزادی بھی برقرار رکھیں گے اور قوم کو نہ صرف دینی علوم کے متخصص اور ماہر علماء مہیا کریں گے بلکہ ان کو عمرانی علوم کے ماہرین بھی تیار کر کے دیں گے جو معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق چلانے میں اہم کردار ادا کریں گے، ان شاء اللہ۔

تفہیم مغرب

ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ [۱]

مغربی تہذیب وفلسفہ۔کفر کی جدید شکل

کفر کی ہمہ گیریت اور ہماری غفلت

کفر مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کے آلات سے مسلح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہو چکا ہے اور اس نے ملت کی صفوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ دنیا بھر میں ہمارے لاکھوں تعلیم یافتہ بھائی ہم سے چھینے جا چکے ہیں اور دن رات چھینے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے ہماری قومی زندگی کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا کر دیا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ ہم اس خطرہ کی شدت کا احساس نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی روک تھام کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا،لیکن اس کے باوجود شاید مسلمان کبھی کسی قومی خطرہ سے اس قدر بے پروا نہیں ہوئے جس قدر اس سے بے پروا ہیں۔

مذاہب کے کفر کے بارے میں ہماری مستعدی

ایک زمانہ وہ تھا، جب ہندوستان میں آریہ دھرم اور عیسائیت ایسے مذاہب نے اسلام کو للکارا تھا۔اس وقت عیسائی مشنریوں اور دیانندی ہندوؤں کی کوششوں سے ہندوستان بھر میں صرف چند پڑھے لکھے مسلمان عیسائی یا آریہ بنے تھے لیکن ہم نے شورِ محشر بپا کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے علماء کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آ گئی تھی،جنہوں نے کتابوں، رسالوں، اخباروں، وعظوں، جلسوں اور مناظروں کے ذریعہ سے مخالفین اسلام کی پے در پے مؤثر تردید کی تھی۔ان علماء نے آریہ دھرم اور عیسائیت کے ماخذ کا بغور مطالعہ کیا اور مطالعہ کے بعد ان پر سنگین اعتراضات وارد کیے اور جو اعتراضات ان کی طرف سے اسلام پر وارد ہوتے تھے، ان کا مسکت جواب مہیا کیا۔ یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ مذاہب کی اس جنگ میں اسلام کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارتداد کا فتنہ رُک گیا۔

---

[۱] پاکستان کے مایہ ناز فلسفی،مصنف،مفکر اور ماہر تعلیم

کفر کی نئی صورت

اب کفر ایک اور لباس میں اسلام کے مقابلہ پر آیا ہے۔اس دفعہ اس کا لباس مذہب کا لباس نہیں بلکہ [تہذیب اور] فلسفہ کا لباس ہے۔ اس لباس میں وہ اسلام کو ہی نہیں بلکہ سارے مذاہب کو ملیا میٹ کر دینا چاہتا ہے۔اس کا یہ خطرناک منصوبہ یہاں تک کامیاب ہے کہ عیسائیت اور آریہ دھرم ایسے وہ مذاہب جو کسی زمانہ میں اسلام کے مقابلہ میں بڑی قوت سے ڈٹے ہوئے تھے، اپنے اس نئے حریف کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکے ہیں اور اب اگر اس کے مقابلہ پر کوئی مذہب میدان میں باقی رہ گیا ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔لیکن اسلام کو بھی اس نے ایسا نقصان عظیم پہنچایا ہے کہ ویدک دھرم اور عیسائیت کے پرستار اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس نے ان مذاہب کی طرح صرف چند مسلمانوں کو نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے اور ابھی اس کی فاتحانہ یلغار بڑھ رہی ہے۔

نئے دشمن کے نئے طریقے

اسلام کے خلاف اس کے نئے دشمن یعنی [تہذیب و] فلسفۂ باطل کی جارحانہ کارروائیاں اس کے پہلے دشمن یعنی مذہب باطل کی جارحانہ کارروائیوں سے بالکل مختلف ہیں۔

جدید باطل کا علم وعقل کے نام پر حملہ

مذہب باطل براہِ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا۔ باطل [تہذیب اور] فلسفہ براہِ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا علم اور عقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔وہ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا، بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں کہیں موجود ہے اور وہ اسے مٹانے کے لیے میدان میں نکلا ہے، بلکہ وہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایک ایسی تشریح کرتا ہے جس میں اللہ، رسول اور دین کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ مذہب باطل عقیدہ اور سند کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کو علم اور عقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف قدرت اور اس کے ناقابل تغیر و تردید قوانین کے نام پر لامذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

باطل فلسفہ کے حملہ کے موقعہ پر غیرتِ دینی کا فقدان

باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری غیرتِ دینی جوش میں آتی تھی، ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور محافظت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ہمیں اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے اور اس کا اثبات اسلام کی نفی ہے، لیکن باطل [تہذیب و] فلسفہ جب اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری غیرت دینی کا جوش کم ہوتا ہے، ہمارا جائز غصہ ٹھنڈا پڑتا ہے اور ہمارے دل میں اس کی جوابی مخالفت اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کمزور ہوتا ہے۔ جب ہم اس کے فریب میں پھنستے ہیں تو بے عملی اور جہالت قبول کرتے ہیں لیکن اسے علم کا نام دیتے ہیں۔ اور بے عقلی اور نادانی اختیار کرتے ہیں لیکن اسے عقل اور زیرکی سمجھتے ہیں ہم اس کی باتوں کو مانتے ہیں لیکن ہمارے دل میں یہ بات نہیں کھٹکتی کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے اور ان کو صحیح ماننے سے اسلام کو غلط قرار دینا لازم آتا ہے۔ ہم اسے دشمن نہیں بلکہ دوست سمجھتے ہیں اور اس سے تعاون کرتے ہیں حالانکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری بربادی کی جن کوششوں میں وہ مصروف ہے وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے زیادہ مؤثر اور زیادہ کامیاب ہو جاتی ہیں۔

آشکار مخالفت

باطل مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شدھی یا بپتسمہ کی ایک خاص رسمی کارروائی میں سے گزرے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جاتا تھا اور ان سے ہر قسم کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیتا تھا۔ اس کی عبادت کی رسمیں اور بود و باش کے طریقے بدل جاتے تھے اور وہ شادی اور بیاہ، دوستی، رشتہ داری اور میل و ملاقات کے لیے ایک دوسری قوم سے راہ و روابط پیدا کرتا تھا۔ اس تغیر سے اس کا کفر واضح ہو جاتا تھا۔ اسلام سے اس کی دشمنی اور نفرت آشکار ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار اور بیدار ہو جاتے تھے۔

کفر کے باوجود مسلمانوں کی صف میں شامل ہونا

لیکن باطل [تہذیب اور] فلسفہ کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا ہے تو

وہ مجبور نہیں ہوتا کہ بپتسمہ یا شدھی کی طرح کی کسی رسمی کارروائی میں سے گزرے یا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے یا ان سے اپنے سماجی ، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کرے یا اپنی بود و باش کے طریقوں کو بدل دے یا شادی، بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اور میل ملاقات کے لیے کسی اور قوم سے راہ و ربط پیدا کرے، کیونکہ اسلام کے اس نئے ہوشیار دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بیزار ہو کر اور اللہ و رسول کے دشمن بن کر رہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم پھر اسلام ہی کے دائرہ کے اندر رہو۔ چنانچہ اس دشمن دین وایمان سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے یا رسالت کے یا حیات بعد الممات کے یا جزا اور سزا کے اور یا ان سب کے۔

کفر کی جدید صورتیں

ان مسلمانوں میں سے بعض ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانہ میں نا قابل عمل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ہی ایک ڈھکوسلہ ہے جو یا تو اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے یا دبی ہوئی جنسی خواہشات کا ردّ عمل۔ پھر ان میں سے کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ اور بیکار سمجھتا ہے، کوئی اسلامی ریاست کی تجویز کو مضحکہ خیز قرار دیتا ہے، کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری حیاتیاتی عمل کی ناجائز، مضر صحت اور خارج از وقت رکاوٹ سمجھ کر ان کا استخفاف کرتا ہے۔ کوئی اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے، کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے، کوئی حج کو، کوئی قربانی کو، کوئی نماز کو اور کوئی روزہ کو۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کے اساسیات کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے غیر اسلامی تصورات ہی کو اسلام کا نام دیتے ہیں اور اکثر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے الگ ہو چکے ہیں، بلکہ ایک ایسی راہ اختیار کر چکے ہیں جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت میں مسلمان بن کر رہتے ہیں، ان سے شادی، بیاہ، دوستی اور رشتہ داری، میل و ملاقات اور کھانے پینے کے تعلقات قائم رکھتے ہیں، بلکہ ان کے جنازے پڑھتے ہیں، ان کی عبادتوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے سیاسی، قومی اور جماعتی عزائم کے ساتھ زبانی طور پر کلیۃً لیکن دل ہی دل میں اپنی مخصوص شرائط کے ماتحت ہمدردی رکھتے ہیں۔

مغربی تہذیب عثمان صفدر [۱]

سرمایہ دارانہ نظام کے نتائج

گزشتہ دوصدیوں سے سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا کو اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو نہ صرف جسمانی بلکہ مالی اور ذہنی ظلم واستبداد پر مشتمل ہے، جس کی بنیاد میں غریبوں کا خون اور چوٹی پر ارتکاز دولت ہے۔ اس نظام کی نس نس میں لالچ وحرص بھری ہے۔ اس نظام کے سرکردہ لوگ اپنے پیٹ کا جہنم لیے پوری دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں اور دولت کا ایندھن اس جہنم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے مزید بھڑکاتا ہے۔ دنیا کی تمام بڑی حکومتیں، بڑی بڑی کمپنیاں اور تمام بنک اس نظام کے آلہ کار ہیں اور صد افسوس کہ مزعومہ اسلامی بنک بھی اسی نظام کی انگلی تھام کر چل رہے ہیں۔ اس نظام سے پہلے بھی دنیا میں غریب بستے تھے لیکن اب غریب کا جینا بھی محال ہے۔ دولت مند بھی رہا کرتے تھے لیکن ان کی آنکھوں پر یوں لالچ کی پٹی نہ بندھی ہوا کرتی تھی۔ گزشتہ دوصدیوں کی تقریباً تمام جنگیں اسی نظام کی بقا اور اس کے سرکردہ افراد کے مفادات کے تحفظ کی خاطر لڑی گئیں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد ان جنگوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ جنگ عظیم اوّل اور دوم اور حالیہ عراق اور افغانستان کی جنگیں ہمارے لیے نمونۂ عبرت ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بھیانک اثرات پوری دنیا میں اپنی خوفناکی کے ساتھ موجود ہیں، ان میں چند حقائق بطور عبرت کے پیش خدمت ہیں:

عالمی غربت کے حوالہ سے چند حقائق

آمدنی میں ظالمانہ تقسیم

دنیا کی نصف آبادی یعنی تقریباً ساڑھے تین ارب افراد کی یومیہ آمدنی 2.50 ڈالر (تقریباً 246 روپے) سے بھی کم ہے۔ [۲]

دنیا کی 80 فیصد آبادی یعنی تقریباً ساڑھے پانچ ارب افراد کی یومیہ آمدنی 10 ڈالر

[۱] چیئرمین المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

[۲] World Bank Development Indicators

(تقریباً984روپے) ہے یعنی300ڈالر(یا29500روپے) ماہانہ ہے۔[۱]

دنیا کے غریب افراد جو کہ عالمی آبادی کا چالیس فیصد ہیں، عالمی آمدنی میں ان کا حصہ صرف پانچ فیصد ہے جبکہ دنیا کے امیر افراد جو کہ عالمی آبادی کا صرف بیس فیصد ہیں، عالمی آمدنی کے تین چوتھائی حصہ پر قابض ہیں۔[۲]

---

[۱] Shaohua Chen and Martin RavallionWorld B

[۲] 2007 Human Development Report (HDR), United Nations Development Program, November 27, 2007, p.25

بھوک کی ستائی دنیا

دنیا میں روزانہ تقریباً ایک ارب افراد بھوکے سوتے ہیں۔

دنیا میں روزانہ پچیس ہزار افراد بھوک کے سبب موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔(۱)

ارتکاز دولت

2006ء میں دنیا کی مجموعی GDP(Gross Domestic Product) 48.2 ٹریلین ڈالر تھی (تقریباً 482 کھرب ڈالر)، جبکہ دنیا کی آبادی ساڑھے چھ ارب تھی۔

دنیا کے فقط 497 ارب پتی افراد جو کہ عالمی آبادی کا 0.000008 فیصد ہیں ان کی دولت 5.3 ٹریلین ڈالر (35 کھرب ڈالر، یا 345 کھرب روپے) تھی جو کہ عالمی GDP کا 7.26 فیصد ہے۔

کم آمدنی والے ممالک ([LIC] Low Income Countries) جن کی مجموعی آبادی ڈھائی ارب ہے ان کی مجموعی آمدنی 1.6 ٹریلین ڈالر (16 کھرب ڈالر) ہے۔(۲)

ایک طویل مدتی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ 1820ء میں امیر اور غریب ممالک کے درمیان فرق کا تناسب 3=1 کا تھا۔ یہ فرق رفتہ رفتہ بڑھنا شروع ہوا اور گلوبلائزیشن کے بعد (تقریباً 1960ء سے) اس فرق میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ فرق 74=1 تک جا

---

(1) Hunger and World Poverty Sources: United Nations World Food Program

(2) World Bank Key Development Data Statistics, World Bank, accessed March 3,2008 Luisa Kroll and Allison Fass, The World's Richest People, Forbes, March 3,2007.

پہنچا۔(یعنی امیر ملک کے ایک شہری کی دولت غریب ملک کے 74 شہریوں کے برابر ہے)۔(۱)

عالمی اقتصادیات کا چیمپئن سمجھے جانے والے ملک امریکہ اور دیگر کئی ترقی یافتہ ممالک کی اپنی آبادی میں یہ فرق تشویشناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ OECD(Organization of Economics Co-operation Development) کے مطابق امریکہ میں یہ تناسب 16=1 کا ہے، یعنی ایک امیر امریکی کی دولت سولہ (16) غریب امریکیوں کے برابر ہے۔(۲)

بھوک اور عیاشیاں

پوری دنیا میں ذاتی اخراجات کی مد میں خرچ کی جانی والی رقم میں دنیا کے 20 فیصد غریب

(۱) 1999 Human Development Report, United Nations Development Programme

(۲) OECD 2005

افراد کا حصہ صرف 1.5 فیصد ہے، اس کے مقابلہ میں 20 فیصد امیر افراد کا حصہ 76 فیصد ہے۔(۱)

عالمی اخراجات میں عدم توازن کی وجہ سے اخراجات کے رجحان میں بھی بہت فرق ہے۔عیاشی اورآسائشات میں خرچ کی جانے والی رقم اس رقم سے کہیں زیادہ ہے جو بنیادی ضروریات پرخرچ کی جاتی ہے۔(۲)

(۱)World Bank, August 2008

(۲)United Nations Human Development Report 1998, Chapter 1,p.37

قرض اور سود

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد دراصل قرض اور اس پر حاصل کردہ سود ہے۔قرض اور سود کے اس عفریت نے پوری دنیا کی معیشت کو بری طرح جکڑ رکھا ہے۔سودی قرض کی ہولناکی کے متعلق چند حقائق درج ذیل ہیں:

۱۔ پوری دنیا کا مجموعی قرضہ 51 ٹریلین ڈالر(510 کھرب ڈالر) کے قریب ہے۔ اور پوری دنیا کی مجموعی آمدنی (GDP)69.98 ٹریلین ڈالر ہے۔یعنی دنیا کا مجموعی قرضہ پوری دنیا کی مجموعی آمدنی کا73فیصد ہے۔

۲۔ اس قرضہ میں ہر منٹ میں تین ملین ڈالر کا اضافہ ہورہا ہے،یعنی ہر چھ گھنٹے میں ایک بلین، ہرروز چار بلین، ماہانہ ایک سوبیس بلین اور سالانہ 1.4 ٹریلین ڈالر کا اضافہ ہورہا ہے۔[1]

۳۔ دنیا کی سپر پاور کی معیشت قرضوں کی دلدل میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے اور دنیا میں کسی بھی ملک پر سب سے زیادہ قرضہ امریکہ ہی پر ہے یعنی تقریباً14 ٹریلین ڈالر، جس کا صرف سود ہی 662 بلین ڈالر ہے جو کہ پاکستان کے مجموعی قرضہ (117 بلین ڈالر) سے چھ گنا زیادہ ہے۔

بیروزگاری

قرض کے جال میں جکڑی معیشت نے ایک اور عفریت کو جنم دیا ہے جسے دنیا بیروزگاری کے نام سے جانتی ہے۔یعنی ایسا شخص جو ہنر مند ہو، باصلاحیت ہو، رزق کمانے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ صرف اس لیے بیکار ہے اور اس کے گھر والے اس لیے غریب ہیں کہ سرمایہ دار

---

[1] The Economist, The Global Debt Clock

زیادہ کمانے کی حرص میں انتہائی محدود افراد کو اجرت پر رکھتا ہے۔ اگرچہ بیروزگاری کے اور بہت سے اسباب بھی ہیں لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ ان تمام اسباب نے سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ بیروزگاری کے عفریت سے ترقی پذیر ممالک (Developing Countries) سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ممالک (Developing Countries) متاثر ہیں۔ [۱]

نجات کا راستہ

ان تمام معاشی واقتصادی مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے کہ اسلامی نظام معیشت کا نفاذ کیا جائے۔ اسلامی نظام معیشت کوئی خواب نہیں، ایک حقیقت ہے۔ یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک دور سے شروع ہوا، عمر فاروقؓ کے دور میں اپنے کمال کو پہنچا اور عثمان غنیؓ کے دور میں اس کے ثمرات ونتائج برآمد ہونا شروع ہوئے۔ یہی وہ واحد نظام ہے جو پانچ سو سال کے طویل عرصہ تک اپنی مکمل آب وتاب سے دنیا میں موجود رہا جبکہ کوئی بھی نظام معیشت ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا حتیٰ کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنے تمام تر جدید وسائل، اثر ورسوخ، پُرکشش دعووں کے باوجود ایک صدی کا مکمل عرصہ بھی طے نہ کر پایا اور

[۱] World Bank, World Development Indicatore-Last updated March 2,2011

اپنی موت آپ مرنے لگا ہے۔

یہی وہ نظام تھا جس نے عرب کے بدوؤں کو دنیا کی سپر پاور بنا دیا۔ غربت کا ایسا خاتمہ کیا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی غریب نہ ملتا جس کا Debt to GDP بالکل صفر تھا، جس میں شرح بے روزگاری صفر تھی، اس سنہری دور کی چند مثالیں پیش نظر ہیں:

ا۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی نظام معیشت کے فیوض و برکات اس طرح عام ہوئے کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے صدقات جمع کرنے کے لیے مقرر ہوئے وہاں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد Xunj ý k bČóo bČYf aeÊVÔYjDj ï کہ زکوۃ ان کے اصحاب ثروت سے وصول کی جائے گی اور ان کے محتاج افراد کی طرف لوٹا دی جائے گی'' کی تعمیل کی۔ تمام ضرورت مندوں میں تقسیم کے بعد بھی ایک تہائی مال بچ رہا وہ انہوں نے دربار امارت میں پیش کر دیا تو امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے وصول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ø ijrMj g FDLÊMΣ "Xu" [ɥ UbDn ŤLrJMk XuLeog من أغنياء الناس فتردّ على فقرائهم ï میں نے تمہیں مال اکٹھا کرنے یا جزیہ وصول کرنے نہیں بھیجا تھا میں نے تمہیں اس کام پر مقرر کیا تھا کہ ان کے مالدار لوگوں سے وصول کرو اور ان کے محتاج اور فقیر لوگوں تک پہنچا دو۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ``O3rMý اليك بشيء وأنا أجد أحدًا يأخذه مني ï میں نے یہ مال آپ کی طرف اس وقت بھیجا کہ مجھے یہاں کوئی وصول کرنے والا نہیں ملا۔

اس سے اگلے سال سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے صدقات کی مد میں موصول ہونے والے مال کا نصف بیت المال کے لیے ارسال کر دیا تو امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر وہی بات کی اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا۔ تیسرے سال یہ ہوا کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں صدقہ لینے والا کوئی نہ ملا اور انہوں نے تمام جمع شدہ مال دار الخلافہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بھجوا دیا۔ خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ میں نے تمہیں مال اکٹھا کرنے یا جزیہ وصول کرنے کے لیے متعین نہیں کیا تھا اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا ``%VΣDý أحدًا يأخذ مني شيئًا ï ۔[1]

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید: ۵۹۶

۲۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (جنہیں پانچواں خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے) نے عراق میں اپنے ولی''عبدالحمید بن عبدالرحمن کو لکھا کہ: YT¶" ﺑ LŇŷø) YT¶"ﻗ b}LŒÚ"3 (للناس أعطيا تهم﴾ لوگوں کوان کے مقررہ وظیفے پہنچاؤ۔تواس نے جواب میں لکھا سب کو ان کے مقررہ وظائف دینے کے بعد بھی بیت المال میں صدقات کا مال باقی ہے تو خلیفہ نے اسے حکم دیا YŒÊ" ì ìýK" ,"AäÊ'PAY¾⁄₃ṣnDFr ºY ,âLè `ÙźnĮ﴿ جائزہ لوکہ جس شخص نے بھی حماقت پر قرض نہ لیا ہو اور نہ ہی فضول خرچی کی بناء پر مقروض ہو گیا ہو اس کا قرض ادا کر دو۔

حاکم عراق عبدالحمید بن عبدالرحمن نے جواب دیا کہ اس طرح کے مقروضوں کا قرض بھی ادا کر دیا ہے تاہم بیت المال میں زائد مال بدستور موجود ہے۔اس پر خلیفہ نے اسے لکھا YŒÊ كلّ بكر ليس له مال فشاء أن تزوّجه فزوّجه وأصدق عنه﴾ اچھی طرح دیکھو جو کوئی غیر شادی شدہ چاہتا ہو کہ تم اسے کی شادی کرو تو اس کے نکاح کا اہتمام کرواور اس کا حق مہر بیت المال سے ادا کرو۔اس نے جواب دیا {AÊçVIDΣO ýkDΣV%﴿ اس طرح کا جو آدمی بھی مجھے ملا، اس کا نکاح کر چکا ہوں۔تو خلیفہ نے حکم دیا ``ÊŒY ýk ìiĿOÙŷ,n جزية فضعف عن أرضه فا سلفه ما يقوى به على أرضه فانا لا نريدهم لعام ولا عامين﴾ اگر کوئی جزیہ دینے والا اپنی زمین کی آمدن سے جزیہ دینے کے قابل نہیں رہا تو اس کو اتنا قرض دو جس سے وہ اپنی زمین سنوار سکے۔ہم ان سے ایک سال نہیں بلکہ دو سال تک کچھ تقاضا نہیں کریں گے۔''[۱]

اسلامی نظام معیشت کی افادیت سمجھنے کے لیے یہ دو مثالیں ہی کافی ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ جب ایسے دور میں غربت کا خاتمہ ممکن ہے جب تجارت کے لیے ناکافی وسائل ہوں، زراعت میں بے پناہ ترقی نہ ہونے کے باوجود تمام افراد کو مناسب غذا مہیا ہو، وسیع پیمانے پر کاروبار نہ ہونے کے باوجود تمام افراد کو روزگار ملے، تو موجودہ دور میں ان تمام وسائل کے ہوتے ہوئے یقیناً ان مقاصد کا حصول بہت ممکن ہے۔

---

[۱] کتاب الاموال لابی عبید:۲۵۱

فہم اسلام

ڈاکٹر محمد امین

مفرور مسلمان لڑکیوں کا نکاح اور اس کی عدالتی حمایت غیر شرعی ہے

حنفی فقہاء اور جج حضرات توجہ فرمائیں

ہمارے ملک میں یہ پریکٹس عام ہوگئی ہے کہ ایک مسلمان لڑکی گھر سے بھاگ کر اپنے یار کے پاس چلی جاتی ہے اور نکاح کر لیتی ہے۔ والدین لڑکی کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی کرتے ہیں تو لڑکی کی رضامندی جان کر جج صاحب فیصلہ دیتے ہیں کہ لڑکی چونکہ عاقل و بالغ ہے اور اس نے اپنی مرضی سے نکاح کیا ہے لہٰذا نکاح صحیح اور جائز ہے۔ اس طرح والدین عدالتی جنگ ہار کر روتے سسکتے عمر بھر کا غم اور روگ لے کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

ہماری رائے میں لڑکی کے حق میں عدالتوں کا یہ فیصلہ غیر شرعی اور خلافِ اسلام ہے۔ اس کے لیے ہمارے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ صحیح احادیث کی بناء پر جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ کنواری لڑکی کے نکاح میں ولی کی رضامندی ضروری ہے۔

۲۔ احناف کو بھی اس سے بایں معنی اتفاق ہے کہ اگر شادی غیر کفو میں ہو یا مہر کم ہو تو ولی کے اعتراض پر نکاح فسخ ہوسکتا ہے۔ تاہم وہ کہتے ہیں کہ نکاح فنی لحاظ سے ایک عقد ہوتا ہے اور اگر فریقین عاقل و بالغ ہوں، اس عقد پر راضی ہوں، گواہان موجود ہوں تو ''قانوناً'' نکاح ہوجاتا ہے۔ احناف کے اس موقف پر انحصار کرتے ہوئے عدالتیں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے نکاح کو جائز اور قانونی قرار دیتیں اور ولی/ والدین کے خلاف فیصلہ دیتی ہیں۔

۳۔ ہم کہتے ہیں کہ ''قانوناً'' کسی کام کے درست ہونے کو عمل صالح اور دوام عمل یعنی پریکٹس (عادۃ محکمۃ) نہیں بنایا جاسکتا جس کی متعدد مثالیں صحیح احادیث اور جمہور علماء کے عمل سے ثابت ہیں مثلاً ایک مجلس میں شوہر کے زبانی تین طلاقیں دینے سے طلاق ''قانوناً'' واقع ہوجاتی ہے لیکن سارے فقہاء کے نزدیک یہ طلاق دینے کا 'سنت' اور صحیح طریقہ نہیں ہے۔ پاکستان میں اس طرح تین طلاقیں دینے کے خلاف باقاعدہ قانون سازی ہوئی ہے جسے پاکستانی علماء عملاً قبول کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک شوہر سے تین طلاقوں کے بعد دوبارہ

رجوع کی صورت ''قانوناً'' یہ ہے کہ خاتون کسی دوسرے مرد سے شادی کرے اور اگر وہ فوت ہوجائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح کرسکتی ہے۔ اگر یہ حرکت پلاننگ سے کی جائے (جسے ہمارے ہاں ''حلالہ'' کہا جاتا ہے) تو ''قانوناً'' یہ درست ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شدید ترین الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے اور اسے دین سے کھلواڑ قرار دیا ہے۔

اسی طرح ایک آدمی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجائے تو وہ ''قانوناً'' مسلمان ہوجاتا ہے اور اسے مسلم معاشرے میں مسلمان ہونے کے سارے حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔ لیکن کیا صرف کلمہ پڑھ کر ''قانوناً'' مسلمان بن جانا کافی ہوتا ہے اگر عمل صالح نہ کیے جائیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کلمہ پڑھ کر ''قانوناً'' مسلمان ہوجائے اور ساری زندگی نماز نہ پڑھے تو کیا یہ صحیح طرز عمل ہے؟ فقہاء تو ایسے شخص کا جنازہ پڑھنے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے بھی منع کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ محض قانوناً کسی چیز کے درست ہونے کو معاشرتی رسم ورواج، عادہ محکمہ اور عمل صالح کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ احناف کی رائے میں ایک عاقل بالغ عورت ومرد کا گواہوں کی موجودگی میں عقد نکاح ''قانوناً'' درست ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو اس بات کی کھلی اجازت دے دی جائے اور اسے جائز پریکٹس قرار دیا جائے کہ وہ چھپ کر غیر مردوں سے یارآشنائیاں لگائیں اور والدین/ ولی کی اجازت کے بغیر بلکہ انہیں معاشرے میں ذلیل ورسوا کرکے اور زندہ درگور کرکے گھر سے بھاگ جائیں اور اس یار سے نکاح کرلیں اور عدالتیں اس نکاح کو جائز قرار دے کر ولی کے خلاف فیصلہ دے دیں۔ اور اب ہمارے معاشرے میں یہ چلن عام ہوگیا ہے کہ لڑکیاں پہلے غیر مردوں سے ناجائز تعلقات قائم کرتی ہیں پھر گھر سے بھاگ کر ان سے نکاح کرلیتی ہیں اور عدالتیں اس حنفی موقف کی آڑ میں ان کے نکاح کو جائز قرار دے کر انہیں آزادانہ زندگی گزارنے کا موقع دیتی ہیں اور والدین/ ولی کے خلاف فیصلہ دے دیتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ خود حنفی فقہاء کو مسلمان لڑکیوں کی اس روش اور عدالتوں کے ان کے نکاح صحیح تسلیم کرنے کی پریکٹس کی مذمت کرنی چاہیے کیونکہ اس سے شریعت کے متعدد مقاصد کی نفی ہوتی ہے اور اس سے متعدد دینی اور معاشرتی مفاسد جنم لیتے ہیں اور بات صرف ''نکاح باکرہ میں ولی کی قانونی حیثیت'' تک محدود نہیں رہتی۔

مثلاً یہی دیکھیے کہ اس سے قرآن وسنت کے بہت سے واضح احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے مثلاً اس سے والدین کی حق تلفی ہوتی ہے۔ انہیں معاشرے میں ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں رہتے۔ اس سے معاشرے میں غیر مردوں سے ناجائز تعلقات بڑھانے اور یارآشنائیوں کا کلچر پروان چڑھتا ہے۔ اس سے معاشرے میں فساد اور قتل وغارت گری کا ماحول فروغ پاتا ہے کیونکہ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کے بھائی اور والد اس صورتِ حال کو قبول نہیں کرتے اور انتقام پر اُتر آتے ہیں۔ اور ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ گھر سے اس طرح بھاگی ہوئی لڑکیاں اپنے گھروں سے دور چھپ کر خوف کی زندگی گزارتی ہیں اور ان کے بھائی اور والد ان کو ڈھونڈتے رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی انہیں قتل کر ڈالتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس پریکٹس میں خود لڑکیوں کا نقصان ہے کیونکہ انہیں چھپ کر ڈر اور خوف کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ وہ والدین کی نافرمانی سے ضمیر کی چبھن کا شکار بھی ہوتی ہیں اور بے سکونی کی زندگی گزارتی ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کی محبت کی شادیاں اکثر ناکام ہو جاتی ہیں اور نوبت طلاق تک پہنچتی ہے۔ اس صورت میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی زندگی عذاب بن جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے پاس واپس نہیں جاسکتی۔ اسے بچے خود پالنے پڑتے ہیں اور ساری زندگی تنہا گزارنا پڑتی ہے۔ اگر اس کے پاس تعلیم وہنر ہو تو ملازمت کر لیتی ہے اور یہ بھی نہ ہو تو ساری زندگی رلتی ہے۔

۴۔ ہم حنفی فقہاء سے یہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ وہ اس بات پر غور فرمائیں کہ وہ غیر کفو اور کم مہر میں نکاح کی بناء پر فسخ نکاح کے کیوں قائل ہیں؟ صرف اس لیے کہ اس میں حدیث کی 'نص' موجود ہے؟ وہ اس امر کی کنہ پر غور فرمائیں کہ شارع علیہ السلام نے غیر کفو میں نکاح سے کیوں منع کیا ہے؟ جو حکمت شارع علیہ اسلام کے پیش نظر تھی یہی تو تھی کہ غیر کفو میں نکاح ولی کے لیے عار کا سبب ہوسکتا ہے اور لڑکی کی شادی کامیاب ہونے میں رکاوٹ ثابت ہوسکتا ہے۔ تو ہم نے سطور بالا میں جو تفصیلات عرض کی ہیں کہ گھر سے بھاگ کر والدین/ ولی کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کے کتنے خوفناک نتائج نکلتے ہیں جن سے شریعت کے بہت سے عظیم مقاصد کی نفی ہوتی ہے، جن میں والدین/ ولی کے لیے دکھ، اذیت، ذلت اور عار کا ایک پہاڑ ہے اور دوسری طرف لڑکی کی شادی شدہ زندگی کے کامیاب ہونے میں کتنی رکاوٹیں ہیں تو انہیں گھر سے لڑکی کے بھاگنے کو کفو پر قیاس کرتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے کہ جن مفاسد کی بناء پر شارع

علیہ السلام نے غیر کفو میں شادی سے منع کیا اور اس پر ولی کو فسخ نکاح کا حق دیا تو موجودہ حالات تو اس سے بدر جہا بدتر ہیں تو یہاں گھر سے بھاگنے کو غیر کفو میں شادی پر قیاس کرتے ہوئے ولی کو فسخ نکاح کا اختیار دیا جانا چاہیے۔ بلکہ نکاح کے بعد اس کے فسخ میں کئی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہٰذا بہتر ہے ولی کا اختیار پہلے ہی تسلیم کرلیا جائے۔

۵۔ فقہاء (اور جج حضرات) کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسلمان لڑکیوں کے گھر سے بھاگ کر یاروں سے نکاح کرنے کا جو رواج چل نکلا ہے اس کی وجہ مغرب کی ملحدانہ اور کافرانہ فکر و تہذیب اور اس کے قائم کردہ اداروں کے قبیح اثرات ہیں۔ مغربی تہذیب عورت کی لامحدود آزادی کی قائل ہے لہٰذا اس کے ہاں عاقل و بالغ عورت جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے بلکہ نکاح کے بغیر بھی جس سے چاہے باہمی رضامندی سے، جنسی تعلق قائم کرسکتی ہے۔ مغربی تہذیب کے قائم کردہ ادارے (مخلوط تعلیم، پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا وغیرہ) فحاشی، عریانی اور زناکاری کا ماحول پروان چڑھا رہے ہیں، اسلامی اقدار کو تباہ کررہے ہیں اور مسلم خاندانی نظام کو شکست و ریخت سے دوچار کررہے ہیں۔ لہٰذا سد الذریعہ کے اصول کے تحت ان ذرائع پر پابندی لگنی چاہیے اور ان ذرائع کے غیر اسلامی استعمال سے جو نتائج نکل رہے ہیں (یعنی لڑکیوں کا یار آشنائیوں میں مشغول ہونا اور گھر سے بھاگ کر اور والدین/ ولی کی مخالفت کرکے اپنی مرضی سے شادی کرلینا وغیرہ) ان کے مبنی بر فساد نتائج کو بھی غیر شرعی قرار دے کر ردّ کیا جانا چاہیے۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ حنفی فقہاء اور جج حضرات کو سد الذریعہ کے فقہی اصول کے مطابق بھاگی ہوئی مسلمان لڑکیوں کے اس طرح کے نکاح کو غیر شرعی قرار دینا چاہیے۔

۶۔ ہم چونکہ ایک خالص قانونی اور فقہی بحث کررہے ہیں لہٰذا ہم اس بات پر فوکس نہیں کررہے کہ والدین کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح اسلامی تعلیم و تربیت پر محنت کریں تاکہ بچوں بچیوں میں بھی یہ سپرٹ پیدا ہو کہ وہ والدین کی ناراضی مول نہ لیں بلکہ ان کی تابعداری اور اطاعت گزاری شرعی فریضہ سمجھ کر کریں۔

۷۔ اسی طرح والدین کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بچیوں کی شادی کرتے ہوئے ان سے رائے ضرور لیں اور ان کی پسند و ناپسند کو سامنے رکھیں اور ان پر جبر کرکے اپنی مرضی اور پسند ان پر نہ ٹھونسیں کہ وہ کوئی اور راستہ کھلا نہ پاکر گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی سے نکاح کرنے

پر مجبور ہو جائیں۔ والدین، علماء، ماہرین معاشرت اور حکمرانوں کا فرض ہے کہ والدین اور اولاد میں شادی کے معاملے میں ڈیڈ لاک کی صورت میں کوئی ایسا معاشرتی ادارہ یا سیٹ اپ قائم کرنے پر غور کریں جو اس مرحلے پر مسئلے کو حل کرنے میں والدین اور بچیوں کی مدد کرے تاکہ معاملات انتہائی اور غیر شرعی رُخ اختیار نہ کریں۔

۸۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کنواری مسلمان لڑکی کے نکاح میں ولی کے کردار کے حوالے سے حنفی موقف کا ناجائز استعمال ہو رہا ہے۔ ہمارے مغربی قانون پڑھے ہوئے جج حضرات مغربی تہذیب کے مطابق عورت کی آزادی کے قائل ہیں اور حنفی موقف کی آڑ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے ان کے یاروں سے نکاح کو جائز قرار دے کر والدین کے خلاف فیصلے دے رہے ہیں لہٰذا حنفی فقہاء کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور مغرب کے الحادی اصول واقدار کی پیروی جس طرح ہمارے گھر اجاڑ رہی ہے اور خاندانی نظام تباہ کر رہی ہے، اس سے عبرت پکڑنی چاہیے۔ مسلمان جج حضرات کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمارے دلائل پر غور فرمائیں۔ مسلمان لڑکیوں کے گھر سے بھاگ کر، والدین کی نافرمانی کر کے بلکہ ان کو زندہ درگور کر کے، اپنے یاروں سے شادیاں کرنے کے رواج کی حوصلہ شکنی ضروری ہے لہٰذا وہ ایسے نکاح کو صحیح قرار دے کر والدین کی عزت واحترام اور اسلامی اقدار کے انہدام کا سبب نہ بنیں۔ ھذا من عندنا والعلم عند الله.

شہیدِ وفا ۔ مُرسیؒ

مرسیؒ کے اعزہ واحباب اور محبین کو مبارکباد اور ظالموں پر اللہ کی لعنت۔ سیسی اور اس کے حواری کفر کے سالار امریکہ کے گماشتے بن کر اور عرب بادشاہتوں کے وظیفہ خوار بن کر کب تک اقتدار میں رہ لیں گے؟ کب تک جی لیں گے؟ افسوس ان پر جو اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے اور اپنی بے عقلی سے تھوڑے عرصے کی دنیاوی راحتوں کے لیے ابدی تکلیفوں کو دعوت دیتے ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مطالعۂ کتاب

پروفیسر ملک محمد حسین

”قلم کا سفر“

از صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی

یہ کتاب علم و ادب کا شاہکار ہے

یہ کوئی بائیس سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے اپنے گاؤں سندرال (ضلع خوشاب) سے اسلام آباد جانا تھا۔ ظہر کے بعد گاڑی میں گاؤں سے نکلا تو اس کا رُخ خوشاب چکوال روڈ کی بجائے الٹی سمت میں خوشاب احمد آباد روڈ پر لِلہ انٹرچینج کی طرف ہو گیا۔ ان دنوں سڑک کا نام تو تھا وجود نہیں تھا۔ راجڑ، ڈھاک اور بانسی بلواں سے ہوتا ہوا آگے بڑھا تو سڑک کے آثار شروع ہو گئے، ذرا آگے گیا تو بگہ شریف کا گاؤں سڑک کے دائیں طرف نظر آیا اور وہاں سے اچھی سڑک شروع ہو گئی۔ بگہ شریف کے پاس سے گزرتے ہوئے میری بچپن کی کچھ یادداشتیں تازہ ہو گئیں۔ بچپن سے ہی بگہ شریف اور بگہ کے علماء اور وہاں کے علمی خاندان کی باتیں اپنے بزرگوں سے سن رکھی تھیں۔ گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے آخری سالوں میں بھیرہ شریف جانے کا اتفاق ہوا جب مَیں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں پڑھاتا تھا۔ تنظیم اساتذہ پاکستان کے تعارف اور اساتذہ کو فرائض منصبی کی طرف مائل کرنے کے لیے اسلامیہ ہائی سکول بھیرہ میں اساتذہ کے ایک بڑے اجتماع سے مخاطب ہونے کا موقع ملا۔ ان دنوں جناب صاحبزادہ ابرار احمد بگوی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح بگہ شریف کے علمی خانوادے کے ایک چشم و چراغ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ صاحبزادہ ابرار احمد بگوی صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل بھیرہ شریف میں ہی دین اسلام کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔

چند سال پہلے جناب صدیق بخاری صاحب کی خدمت میں لاہور میں حاضر تھا تو وہاں ایک لمبے تڑنگے جواں سال بزرگ تشریف لائے۔ تعارف ہونے پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ موصوف بگہ شریف کے علمی خانوادے کی سربرآوردہ شخصیت صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب ہیں۔ صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب کے تنقیدی مضامین ماہنامہ ”شمس الاسلام“ میں پڑھ چکا تھا۔ ان مضامین میں صاحبزادہ صاحب نے میرے استاذِ محترم پروفیسر صاحبزادہ

عبدالرسول کی کتاب ''تاریخ سرگودھا'' پر ناقدانہ لیکن عالمانہ اور بہت تفصیل کے ساتھ قلم اٹھایا تھا۔صاحبزادہ عبدالرسول صاحب تاریخ کے پروفیسر اور مانے ہوئے عالم ہیں۔میں نے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بی ایس سی کے دوران ان سے تاریخ تہذیب وتمدن کا مضمون پڑھا ہے اور مَیں ان کی علمی وجاہت، تدریسی ابلاغ اور قدرتِ کلام سے بہت متاثر تھا اور ہوں لیکن صاحبزداہ انوار احمد بگوی کا 'تاریخ سرگودھا' پر علمی تبصرہ اور تنقید پڑھ کر میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہوگیا کہ دونوں صاحبزادہ گان میں 'تاریخ سرگودھا' کے حوالے سے معلومات میں کون برتر ہے۔صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب کے متعلق شک پڑتا ہے کہ وہ میڈیکل ڈاکٹر بھی ہیں کیونکہ ایف ایس سی کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم رہے۔ بعد میں پبلک ہیلتھ میں ڈگری بھی لی، کئی اضلاع میں ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفسر رہے اور پنجاب کی سطح پر محکمہ صحت کے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے حتیٰ کہ اب منصورہ ہسپتال لاہور کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہیں جہاں کا انتظام وانصرام دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ہمارے دامن میں ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں کہ جہاں ہم سے منصورہ ماڈل سکول ڈھنگ سے نہیں چلایا جارہا وہاں ایک اسٹیٹ آف دی آرٹ ہسپتال سر اٹھائے کھڑا ہے۔

تمہید کچھ طویل ہوگئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل یہ طویل تمہید قلم کے ایک طویل سفر کے ذکر کے لیے لکھنا پڑی۔ ''قلم کا سفر'' صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی کے مضامین کے انتخاب پر مبنی ایک ضخیم کتاب ہے جسے پڑھ کر احساس ہوا کہ یہ مضامین کسی علم وادب کے اعلیٰ شہسوار، دینی علوم کا گہرا ادراک رکھنے والے اور باریک بینی سے مشاہدہ کی صلاحیت کے ساتھ اپنے مشاہدات کو اس طرح بیان کرنے پر قادر کوئی شخصیت ہے جو قاری کی انگلی پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

بچپن میں ریڈیو سیلون سے انڈین گانے سننے کا شوق تھا اور ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ سیلون یعنی سری لنکا کی سیاحت کی جائے۔ یہ خواہش خواہش ہی رہی تاوقتیکہ قلم کے سفر میں صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب کا سفر نامہ سری لنکا پڑھنے کا موقع ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ بگوی صاحب کے قلم کے سفر نے ہی سری لنکا کی سیر وسیاحت کا پورا سفر کرا دیا۔

ڈاکٹر بگوی صاحب کا ''قلم کا سفر'' ایک عجیب سفر ہے جو شاخِ زریں کے کنارے سے

شروع ہوتا ہے اور آپ بیتیوں کی تلخیص کرتا، اداروں اور افراد کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کرتا، اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا، عظیم شخصیات کی روشنی بکھیرتا، احوالِ وطن کی تصویر کشی کرتا، علماء اور مشائخ بگویہ کا مشک بار تذکرہ کرتا، انگریزی میں لکھی گئی نگارشات پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ''افکارِ معلم'' میں ''شاخ زریں کے کنارے'' قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ اب ایسے شاندار سفرنامے کی اگلی قسط کا مہینہ بھر انتظار کرنا میرے لیے سوہانِ روح تھا لیکن جب صاحبزادہ ڈاکٹر انوار بگوی صاحب کی طرف سے ''قلم کا سفر'' کا تحفہ ملا تو مسئلہ حل ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے فوٹو میموری عطا کی ہے کہ سیاحت کے دوران جو کچھ دیکھتے ہیں اپنے گہرے مشاہدے کے ساتھ پوری جزئیات کے ساتھ اپنے ذہن میں ایک فوٹو فلم کی طرح محفوظ کرتے جاتے ہیں اور جب بیان کرتے ہیں تو وہ پوری فلم ادبی چاشنی کے ساتھ پڑھنے والے کو پیش کر دیتے ہیں۔ شاخ زریں میں ڈاکٹر بگوی صاحب نے جس طرح سڑکوں، گلیوں، عمارتوں، ریستورانوں اور تاریخی مقامات کا ذکر کیا ہے قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی ڈاکٹر بگوی صاحب کے ساتھ ہم سفر ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ذکر روح کو سرشار کر دیتا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی استنبول میں قبر مبارک اسلامی تاریخ کا ایک عظیم سنگ میل ہے جو ہمیں شاندار ماضی کی یاد دلاتا ہے، وہ ماضی کہ جس کا ہم اب صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بگوی صاحب ایک اعلیٰ علمی خانوادے کے فرزند ہیں اس لیے خاندان کی علمی وراثت ان کی تحریروں میں صاف نظر آتی ہے لیکن شاید پاکستان کے اولیں سالوں کا نصابِ تعلیم جس میں سائنس کے طالب علم کو آٹھویں کے بعد اردو تو پڑھنا شاید ممکن نہیں تھا لیکن فارسی بطور اختیاری مضمون کی تدریس طلبہ کی تحریروں میں ادبی حسن پیدا کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر بگوی صاحب کی خوبصورت ادبی تحریروں میں فارسی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس پر نسیم حجازی کے ناولوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی کی علمی مجالس میں آمدورفت نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ڈاکٹر بگوی صاحب اپنے احوال زندگی بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں کہ ''مولانا امین احسن اصلاحی کی علمی مجلس بلکہ صحبت نے مذہب سے زیادہ علم وادب سے تعلق مزید گہرا کر دیا''۔ صاحبزادہ انوار احمد بگوی کی مذہب میں گندھی ہوئی شخصیت جو علم وادب کے میدان کی شہسوار نظر آتی ہے بعض اوقات قاری کو شک میں مبتلا کر دیتی ہے کہ کیا صاحبزادہ انوار احمد بگوی میڈیکل ڈاکٹر بھی ہیں جو بیماروں اور بیماریوں سے نبھا کرتے کرتے اپنا مزاج اور مزاح دونوں بیمار کر لیتے ہیں۔

لیکن میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے سبب ڈاکٹر بگوی صاحب میں گہرے مشاہدے، تجربے اور صلاحیتِ اخذ میں گہرائی آئی ہے نیز علم وادب کا شہسوار ہونے کی وجہ سے ان کی طبی روح اور مزاج میں خشکی اور روکھا پن پیدا نہیں ہوا۔ قلم کے سفر میں ان کے دو مزاحیہ مضامین اس کا ثبوت ہیں نیز ان سے مل کر بھی آپ محسوس کرتے ہیں کہ جواں سال بزرگی کے اس دور میں بھی شگفتگی قائم ہے۔

''قلم کا سفر'' اپنے اندر ایک جہانِ علم لیے ہوئے ہے۔ معلومات کا خزینہ ہے۔ نادر دینی معلومات ہیں۔ شخصیات کا زندہ تذکرہ ہے اور سب سے بڑھ کر خاندانِ بگویہ کی بھرپور معلومات ہیں۔ ڈاکٹر بگوی صاحب نے ''قلم کے سفر'' کے علاوہ تذکارِ بگویہ کے عنوان سے پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک انسائیکلوپیڈیا طرز کی چیز ترتیب دی ہے جو صرف بگوی خاندان کا تذکرہ نہیں بلکہ ضلع شاہ پور (اب ضلع سرگودھا+ضلع خوشاب) اور اس کے نواحی علاقوں کی علمی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور دینی تحریکات کا ایک مرقع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کتنا زرخیز اور مردم خیز ہے۔ انگریزوں نے بھی شاہ پور کا گزیٹیئر چھاپا تھا لیکن تذکرہ بگویہ ضلع شاہ پور کے حوالے سے ہمارے قومی نقطۂ نگاہ سے زیادہ وقیع دستاویز ہے۔

میں سائنس کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں لیکن اردو ادب سے بھی کچھ شغف رہا ہے۔ اس کے باوجود نسیم حجازی کے ناولوں کے علاوہ کسی دوسرے ادیب کا ناول پڑھ کر لکھ لطف نہیں اٹھایا۔ علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے علاوہ دوسرے شعراء نے کبھی حظ نہیں دیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتب کے علاوہ کسی اور عالم دین کی کتاب کے چند صفحات بھی سر میں درد کرائے بغیر کبھی نہیں پڑھ سکا۔ مولانا سید ابواعلیٰ مودودی کی نثر کے بعد صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب کی ضخیم کتاب ''قلم کا سفر'' وہ پہلی کتاب ہے جو کئی دنوں سے زیر مطالعہ ہے اور ابھی تک بوریت قریب تک نہیں پھٹکی۔ کئی ایک مضامین دو، دو بار پڑھے ہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں کہیں کہیں پریشان کرتی ہیں اور دو ایک مقامات پر سوالات بھی ذہن میں پیدا ہوئے جن کا تذکرہ ان شاء اللہ ڈاکٹر بگوی صاحب سے عند الملاقات ہوگا لیکن دل چاہتا ہے کہ 'قلم کا سفر' کا نام لیے یہ عظیم مجموعۂ مضامین اکثر لائبریریوں کی زینت بنے اور نئی نسل اس سے استفادہ کرے۔

عالم اسلام　　مدیر

امریکہ، ایران اور مشرق وسطیٰ

عالم اسلام کے حکمران امریکی وصہیونی سازشوں کو کب سمجھیں گے؟

۱۔صہیونی وامریکی سازشوں کا ماہرانہ تجزیہ کرنے والے نیوی کے ریٹائرڈ کموڈور طارق مجید صاحب نے ایک نشست میں ہمیں بتایا کہ ہم جیسے کوتاہ بین (Short-Sighted) لوگ اندازہ نہیں کرسکتے کہ صہیونی اور امریکی کتنی لمبی اور دوررس پلاننگ کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال انہوں نے یہ دی کہ 9/11 کا واقعہ سی آئی اے اور موساد کے ہاتھوں ۲۰۰۱ء میں برپا ہوالیکن امریکہ نے پاکستان سے کراچی پورٹ پر ایک برتھ ۱۹۹۶ء میں ۲۵ سالہ لیز پر لی اور اس طرح لی کہ اس پر کسی پاکستانی فرد اور ادارے کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو اُس نے لیز پر لی ہوئی اِس برتھ کا اس طرح استعمال کیا کہ ہزاروں فوجی، لاکھوں ٹن بارود اور بم، ہزاروں فوجی گاڑیاں اور ان گنت ساز وسامان امریکہ نے اس برتھ کے ذریعے بھیجا اور آج تک اس طرح بھیج رہا ہے کہ پاکستان کو بھی اس کی تفصیلات کی خبر نہیں۔ یہ ہوتی ہے ایڈوانس پلاننگ۔ تازہ امریکہ ایران تنازُع کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ سب بنیادی طور پر صہیونی پلاننگ ہے جو گریٹر اسرائیل کی خاطر عالم اسلام خصوصاً مشرق وسطیٰ اور قریبی علاقوں کو ٹارگٹ کیے ہوئے ہے۔

۲۔ صہیونی اور امریکی سازشیں Multi-faceted ہوتی ہیں یعنی بیک وقت ان کے کئی چہرے ہوتے ہیں اور اکثر اوقات امریکہ بیک وقت دوستی اور دشمنی کے کردار نبھا رہا ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان میں دہشت گردی کے فروغ کے لیے اس نے بھارت کے ساتھ مل کر تحریک طالبان پاکستان (TTP) بنوائی اور ڈالر، اسلحہ اور تربیت دے کر اسے پاکستان اور پاکستانی فوج سے لڑوایا۔ دوسری طرف پاک فوج کے سالار راحیل شریف پر دباؤ ڈال کر اس کے خلاف وزیرستان آپریشن کروا ڈالا، دونوں صورتوں میں نقصان پاکستان کا ہوا بلکہ ابھی تک ہو رہا ہے۔

سی آئی اے اور موساد کے عقابی نظر رکھنے والے تجزیہ کاروں نے شیعہ سنی اختلاف کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور یہ بھی نوٹ کیا کہ ایرانی اپنا انقلاب ایکسپورٹ کرنا چاہتے ہیں اور

مشرق وسطیٰ میں شیعہ عناصر کے ساتھ مل کر شیعہ بیلٹ کو مضبوط کرنا اور اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے انتہائی خفیہ انداز میں ان کے لیے راہ ہموار کی اور ایرانیوں کو پہلے عراق دیا گیا، پھر انہیں شام میں گھسنے کا راستہ سجھایا گیا اور اب انہیں یمن میں گھس کر سعودی عرب کے لیے خطرہ بننے کا موقع دیا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ سعودیوں اور خلیج کے چھوٹے ممالک کو ایران کا ہوّا دکھا کر ڈراتا رہتا ہے اور ان کو اربوں ڈالر کا اسلحہ بیچتا رہتا ہے۔ کئی دہائیوں سے یہ علاقے امریکہ کی جیب میں ہیں اور سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، اومان، امارات ہر جگہ اس کے فوجی اڈے اور فوج موجود ہے لیکن مسلم حکمرانوں کی عقل شاید گھاس چرنے گئی ہوئی ہے اور انہیں امہ کے مفادات اور صورتِ حال کی نزاکت کا کوئی احساس ہی نہیں۔

۳۔ اس وقت جو امریکہ ایران کشمکش چل رہی ہے، اس کے بھی ٹوپی ڈرامہ ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ممکن ہے تیل کے جہازوں پر حملہ سی آئی اے اور موساد نے خود ہی کرایا ہو اور اس کا مقصد درحقیقت پاکستان اور چین کو دباؤ میں لینا اور گوادر اور سی پیک کو غتر بود کرنا ہو۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تیل کا وہ ذخیرہ کدھر گیا جو بلوچستان کی سمندری حدود میں موجود تھا.... بلکہ ہے۔ لیکن ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ پاکستان اسے حاصل نہ کر سکے اور آئی ایم ایف کے رگڑے کھاتا رہے اور اس کے عوام مہنگائی کے ہاتھوں دم توڑتے اور اپنی حکومتوں کو کوستے رہیں۔ اس سے پہلے بھی بلوچستان میں تیل نکلا تھا لیکن امریکہ اور شاہ ایران نے اسے آپریشنل نہیں ہونے دیا تھا۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار.**

افغانستان میں آنے کا امریکی ہدف شاید اتنا افغانستان نہیں تھا جتنا پاکستان تھا۔ وہ پاکستان کا ایٹم بم تو نہیں چھین سکا البتہ اس کی معیشت کا ستیاناس کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور اسے سنبھلنے بھی نہیں دینا چاہتا۔ پاکستان نے اگرچہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے چین (اور روس) کی طرف ایک راہداری نکال لی ہے لیکن اس کے شواہد موجود ہیں کہ پاکستان کی عسکری اور سیاسی قیادت امریکی چھتری سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پا رہی اور اس امر کے شواہد بھی موجود ہیں کہ یہی خوئے غلامی چین کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں بھی کارفرما ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستانی حکمرانوں کو ایمانی جرأت اور فراست عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے ملک اور اپنی امت کے لیے آزادانہ روش اپنا سکیں۔ کم از کم اتنی ہی سہی جتنی ترکی کے اردوان نے اختیار کی ہے۔

تبصرۂ کتب مدیر

تعارفِ کتب

اہل قرآن کے تاویلاتی افکار اور نماز پنجگانہ کا تحقیقی مطالعہ ۔ ظفر اقبال خاں

۵۳۶ صفحات کی یہ ضخیم کتاب غالباً مصنف کا علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس کی زبان ثقیل وادق ہے۔ موصوف کا تخصص الٰہیات ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے انہوں نے اس کتاب میں نماز کے حوالے سے منکرین سنت (جو خود کو اہل قرآن کہلوانا پسند کرتے ہیں) کے موقف کی تردید کی ہے۔ کتاب کی قیمت ۷۰۰ روپے ہے اور یہ ادارہ اسلامیہ، حویلی بہادر شاہ، جھنگ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ رابطہ 0300-7381190

سلیقۂ انسانیت کا بحران اور بچاؤ کی تدابیر ۔ حافظ محمد موسیٰ بھٹو

حافظ محمد موسی بھٹو صاحب حیدرآباد سندھ میں علم وتزکیہ کی بزم سجائے بیٹھے ہیں۔ اسلام، تہذیب مغرب، دینی تحریکوں، تصوف وتزکیہ پر ان کی بیسیوں کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں۔ سندھ میں قوم پرستی اور دہریت ان کا خصوصی ہدف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تزکیۂ نفس نہ صرف مسلمانوں کی عبادات واخلاق ومعاملات کی جان ہے بلکہ اس سے محروم ہوکر ایک شخص ان بنیادی انسانی اوصاف سے بھی محروم ہوجاتا ہے جس کی توقع بحیثیت انسان ہم اس سے کرتے ہیں۔ بھٹو صاحب چونکہ اپنے سامنے ایک مشن رکھتے ہیں لہٰذا وہ اپنی کتابوں کی قیمت اتنی کم رکھتے ہیں کہ شاید ہی لاگت پوری ہوتی ہو۔ ۱۴۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپے ہے اور یہ سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ۴۰۰ بی لطیف آباد، حیدرآباد، (سندھ) سے مل سکتی ہے۔
فون نمبر: 0336-3039299

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ ۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ

یہ ماہنامہ الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر ہے جو فاضل مدیر نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا اور جو اس وقت کے اکابر علماء کی اہم نگارشات پر مشتمل تھا اور جس میں حضرت شاہ صاحب کے علوم

ومعارف اور شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی۔ چونکہ اصل رسالہ عرصہ سے ناپید تھا اس لیے لاہور کے عالم دین جناب قاری جمیل الرحمن اختر صاحب نے ہمت کی اور اس کی عکسی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اگر اس کی تدوین نو یا اس میں اضافوں کا اہتمام ہو جاتا تو مزید بہتر ہوتا لیکن موجودہ صورت میں بھی یہ ایک اعلیٰ علمی خدمت ہے اور قاری صاحب اہل ذوق کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک نادر تحریر کی اشاعتِ ثانی کا اہتمام کیا۔ یہ تذکرہ انجمن خدام الاسلام حنفیہ قادریہ، ۲۸۵ جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ رابطہ نمبر: 0300-9496702

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 500 روپے تاحیات 10,000 روپے

نام..................................

پتہ..................................

فون..................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں